بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۱ | ۱۰، ۲۵ رجون ۲۰۲۴ء مطابق ۳، ۱۸ رذی الحجہ ۱۴۴۵ھ | شمارہ نمبر ۱۵-۱۶

اس شمارے میں

تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری	علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ	۴
شوق جب عشق کا احرام باندھ لیتا ہے	محمد عمیر الصدیق ندوی	۵
بلدِ امین کی اہم ترین ذمہ داری	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	۷
عید قرباں، اول المسلمین کی یادگار	مولانا عبدالماجد دریابادیؒ	۱۲
مسلمان اپنے کو اللہ کی مرضی.....	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ	۱۴
عالم انسانیت پر احسانات وانعامات	مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۱۶
دینی مزاج اسلامی معاشرہ کی.....	مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی	۱۸
تم کس بات پہ اتراتے ہو؟	مولانا مفتی محمد تقی عثمانی	۲۲
آج کی سب سے بڑی قربانی	مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی	۲۵
پروپیگنڈہ کو سمجھیں اور برادرانِ وطن.....	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۲۷
جامع عبادت اور اسلامی زندگی.....	ڈاکٹر سراج الدین ندوی	۳۰
حرمِ کعبہ: پہلا گھر خدا کا	نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی	۳۲
میرے مشفق ومربی استاذ گرامیؒ	عمر محبوب ندوی	۳۴
حیاتِ فانی اور حیاتِ دائمی	عبید الرحمٰن ندوی	۳۵
'دولتِ عثمانیہ اور ترکی کی تاریخ'	محمد اصطفاء الحسن ندوی	۳۷
مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ	محمد فرمان ندوی	۳۹
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے.....	محمد اعظم ندوی	۴۴
قربانی کی اصل روح اور اس کا پیغام	محمد سلمان ندوی بجنوری	۴۷
سوال وجواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۴۹

سرپرست

حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول: شمس الحق ندوی

نائب مدیر: محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر: محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی ❁ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت: مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❁ مولانا محمد خالد غازی پوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرتعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT
A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)
IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157
State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ایم میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

TAMEER-E-HAYAT
Tagore Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Ph.:0522-2740406
website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/400	فی شمارہ -/20	ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے 75$

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر =/30₹ جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلدی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعر وادب

تُو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ

ہو نہ یہ پھُول تو بُلبل کا ترنُّم بھی نہ ہو
چَمنِ دہر میں کلیوں کا تبسّم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو، خُم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا اِستادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں، دامنِ کُہسار میں، میدان میں ہے
بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراقش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے

چشمِ اقوام یہ نظّارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ 'رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ' دیکھے

مَردمِ چشمِ زمیں یعنی وہ کالی دنیا
وہ تمھارے شُہَدا پالنے والی دنیا
گرمیِ مہر کی پروَردہ ہلالی دنیا
عشق والے جسے کہتے ہیں بِلالی دنیا

تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نُور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

عقل ہے تیری سِپَر، عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش! خلافت ہے جہاں گیر تری
ماسِوَی اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری
تُو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

☆☆☆☆☆

اداریہ

شوق جب عشق کا احرام باندھ لیتا ہے

محمد عمیر الصدیق ندوی

ان شاء اللہ ''تعمیر حیات'' کا یہ شمارہ مکمل ہوکر اس وقت قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا جب عبادتوں کے موسم کے مکمل ہونے کا حج کے ذریعہ اعلان ہوگا۔ ایک بار مولانا عبداللہ عباس ندوی مرحوم نے اسی ''تعمیر حیات'' کے صفحات میں لکھا تھا کہ تکمیل کا مطلب اختتام نہیں۔ عبادات کا یہ اسلامی سلسلہ یوں ہی جاری ہے گا، ہر دن نماز، ہر ہفتہ جمعہ، ہر سال مہینے بھر کے روزے، ہر برس مال و دولت کی صفائی، زندگی میں کم از کم ایک بار حج کی اجتماعی بندگی، یعنی دلوک شمس سے غسق لیل، زندگی کے آخری پہر تک یہ سلسلہ ختم نہیں ہونے والا، ہاں ضابطوں کے احترام میں ہر سال تکمیل کا فریضہ ضرور پورا کیا جاتا رہے گا۔

حج اس سلسلۂ عبادات کی گویا آخری کڑی ہے، اسی لیے امت کا برگزیدہ اور نہایت کامل شعور اس عبادت کے راز کو پانے میں دل و نگاہ اور روح کی ساری توانائیاں صرف کرتا رہا، اسلام سے پہلے اس حج کی تفصیلات شاید کسی مصلحت سے پردۂ راز ہی میں رہ گئیں، سیدنا آدمؑ سے سیدنا ابراہیمؑ اور پھر نبوتِ محمدیؐ کے آغاز تک اگر حج کی راہوں میں نقش ہونے والے قدموں کے نشانات مل جاتے تو وہ خدا جانے کیا کہہ جاتے؛ لیکن اسلام کے آنے کے زمانہ سے اب تک جو کچھ ہے، اس کی مثال شاید دنیا بھر کا ادب پیش کرنے سے قاصر ہو۔

حج کی عبادت اور موسم حج کے اسرار و رموز ذہن و قلب پر کیسے کھلتے ہیں، اسلام کی پندرہ سو سالہ تاریخ میں اس کے بے شمار مظاہر ہیں، ان کی ایک شکل سفر نامہ کی ہے، حج کے سفر نامے صرف اردو میں تلاش کیے جائیں تو شاید برسوں تک محققین و مدونین کی ایک بڑی جماعت بھی دن رات کی محنت کے باوجود اس کی وسعتوں کو نہ سمیٹ پائے، بادشاہوں، نوابوں، امراء، علماء، ادباء و شعراء کے ساتھ ساتھ خدا جانے کتنی عام اور گمنام تحریریں سامنے آجائیں، کمال یہ ہے کہ سارے جذبے، زبان اور لہجوں کے فرق کے باوجود سرشاری و سرمستی کی کیفیت میں جیسے ایک ہی لطف و لذت میں ڈھلے ہوئے ملتے ہیں، جنت کی نعمتوں کے ذکر کے ساتھ مکہ مدینہ کے شوق کا یکساں انداز، جنت کی طلب کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھوں میں مکہ مدینہ کی دید کا ارمان پورے ہونے کی دعا، دیکھا جائے تو حج کی عبادت کو وہ مقام عطا کرتی ہے جس کو دیکھ کر دوسری عبادتوں کو بھی رشک آجائے۔

جب جب حج کی بات ہوتی ہے تو احرام، طواف، حجر اسود کا بوسہ، صفا و مروہ میں اظہارِ بے تابی، منی کے خیموں والے رات دن، عرفات کے میدان میں گریہ وزاری سے سیراب ہوتی آنکھیں، مزدلفہ کی تاریک رات میں برائی کی

سب سے بڑی علامت کو ذلیل کرنے کے لیے سنگ ریزوں کی تلاش، جمرات میں اچھائیوں کے برائی پر غیض و غضب کا تیور، جسم و جاں کو قربان کرنے کے عہد کی ابراہیمی سنت کا تسلسل، ان سارے پہلوؤں کا صدیوں سے اہل فکر وشعور کے ذریعہ اظہار، یہ ساری باتیں حج کو واقعی دوسری عبادتوں کے لیے قابل رشک بنادیتی ہیں، اور شاید اسی لیے حج کرنے والا بھی دوسروں کے لیے قابل رشک بن جاتا ہے۔

یہ بھی کسی حج کرنے والے کے لیے کم نعمت نہیں کہ اگرچہ ساری عبادتیں اللہ ہی کے لیے ہیں؛ لیکن یہ حج کی بات قرآن کریم میں جب جب آتی ہے تو جیسے خاص طور پر یاد دلایا جاتا ہے کہ حج تو اللہ ہی کے لیے ہے، حج کا سفر کرنے والے کو سامانِ سفر کی یاد اس طرح دلائی جاتی ہے کہ یہ سامان تو بس اللہ کا ہر لحظہ خیال رکھنا ہے، یہی سب سے عمدہ سامانِ سفر ہے، تقوی کو سمجھانے کے ہزار پیرائے ہیں؛ لیکن سب کی بنیاد میں اللہ کو اپنے سامنے رکھنے کی عادت ڈالنا ہے، نیکیاں اچھی لگنے لگیں اور برائیوں سے گھن آنے لگے، جب ظاہری اور باطنی دونوں طرح کے احساسات میں یہ رنگ شامل ہوجائے تو وہی تقوی ہے، باتوں میں، سانسوں میں، نگاہوں میں، سوچوں میں اللہ کو شامل کرنے کے لیے حج ہی کو عنوان بنادیا گیا جہاں جہاں جو جو حج کی نشانی ہے، اس سے دل کا رشتہ عظمتوں کے ساتھ ہوجائے، اسی بات کی تلقین شعائر اللہ کی تعظیم سے کرنے سے کی گئی، اسے دل کا تقوی کہا گیا، صفا ومروہ ہوں یا کہ بیت العتیق ہو جو اللہ تعالیٰ کی باتوں میں رنگ بھردے وہی تعظیم کے لائق ٹھہرا۔

یہ بات معمولی نہیں کہ محبوب خود اپنے عشاق سے کہے کہ مجھ کو یاد کرو، یاد کرتے رہو، بالکل اسی طرح جیسے تم اپنے پیارے باپ دادوں کی یادوں میں سرشار ہوجاتے ہو، اس سے کہیں زیادہ اور یہ تب جب رسمی اظہارِ عشق کی ہر ادا سے گزر چکے ہو، "فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا" حج حد سے ماورا دوستی کی علامت ہے، یہ خلیلی کا قرینہ سکھانے کی ادا ہے، یہ دوستی کی راہ میں سب کچھ قربان کرنے کی وہ علامت ہے جس کے بعد پھر کسی اور محبت کے ثبوت کی ضرورت ہی نہیں رہتی، کوئے جاناں کے پھیرے لگانے کی اس میں وہ لذت ہے کہ پھر کسی اور در کی خواہش ہی نہیں رہتی، ایسے ہی نہیں یہ جذبات شعر میں ڈھلے تھے کہ:

بدت لی أعلام بیت الهدی
بمکة والنور بادٍ علیه
فأحرمت شوقاً له بالهوی
وأهدیت قلبی هدیاً الیه

عشق اور اس کی راہ میں ساری متاعِ عقل وخرد قربان کردینے کی داستان کا سرعنوان لفظ حج کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟

☆☆☆☆☆

روح پرور

بلدِ امین کی اہم ترین ذمہ داری

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

حج ملت کا ایک ایسا سالانہ اجتماع ہے، جس میں سب مسلمان ایک خاص عقیدہ، مقصد اور جذبہ کے ساتھ بہترین دینی و روحانی اور ایمانی ماحول میں ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہوتے ہیں، اور اس سے نئی قوت اور نئی روح حاصل کرتے ہیں، ان کے عقائد میں ان عجمی تہذیبوں اور اجنبی فلسفوں کے اثر سے یا اپنے پڑوسی ممالک اور قوموں کی تقلید کے نتیجہ میں جو کجی، اور ان کے طرزِ زندگی اور عادات واطوار میں جو فساد یا کسی قسم کی کوئی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے، وہ اس کی روشنی میں اس کی اصلاح کرتے ہیں، اور ان کو اس کا موقع حاصل ہوتا ہے کہ وہ دین کو اس ''چشمۂ صافی'' سے اخذ کرسکیں جو ہر قسم کی آلودگی، کج روی اور تحریف سے پاک اور محفوظ ہے، اس لیے عقل ومنطق کی رو سے بھی اور اسلام کی روح اور حج کی حکمت کے لحاظ سے بھی یہ ضروری ہے کہ یہ بلدامین جن سے یہ سارا حج متعلق ہے، حقیقی، سچی، نکھری اور دھلی ہوئی اسلامی زندگی کی امانت ہمیشہ محفوظ رکھے اور اس کے تمام پہلوؤں اور تمام خصوصیات اور مظاہر کی تصویر اس طرح پیش کرسکے کہ ہر زائر اور حاجی (خواہ اس کو بہت محدود وقت ملا ہو) اس فرق وامتیاز کو اچھی طرح محسوس کرلے؛ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں اس کا ذائقہ چکھ لے، اور اس کو چھو کر اور برت کر دیکھ لے، اللہ تعالیٰ نے اس مبارک شہر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حج کا مرکز بنایا ہے، اور ہر مسلمان کی جائے پناہ اور مقام امن قرار دیا ہے، وہ اس شہر میں بجا طور پر یہ تصور لے کر آتے ہیں کہ وہ اس شہر میں جارہے ہیں جو تقدس وپاکیزگی کا سرچشمہ اور اسلام کا روحانی پایۂ تخت ہے، اور اس سے دین نکل کر سارے عالم میں پھیلا ہے، ایک عام مسلمان جو مرکز اسلام سے بہت دور رہتا ہے، یہاں پہونچ کر قدرتی طور پر ہر چیز کو حجت سمجھتا ہے، جو بات اس کے کان میں پڑتی ہے، اور اس کی آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہی اس کے نزدیک سب سے بڑا، صحیح اور آخری معیار ہے، اس لیے کہ عام مسلمانوں کے لیے اہل مکہ اور اہل مدینہ کے عمل سے بڑھ کر اب بھی کسی کا عمل دلیل وحجت اور معیار صداقت نہیں۔

یہ انسانی فطرت ہے جو منطق وفلسفہ کی موشگافی یا خطابت وبلاغت کے زور سے بدل نہیں سکتی، کوئی مذہب یا تہذیب ہو اس کے ماننے والے ہمیشہ اس کے مرکز پر نظر رکھتے ہیں، اور اسی کی بات کو حجت اور قول فیصل سمجھتے ہیں، تہذیب وقانون اور زبان وادب ہر شعبہ میں بھی یہی چیز کارفرما ہے، چنانچہ لغت قریش اور درجہ کی قرار دی گئی، اس کے بعد اہل بادیہ کی زبان ہے جو تمام اہل عرب اور ان کے لہجوں، محاوروں، تعبیروں اور اسالیب کلام کے لیے حجت ہے، اسی طرح اہل مدینہ کا عمل مالکی مذہب میں حجت سمجھا جاتا تھا، اندلس کے علمی اور ثقافتی عروج کے زمانہ میں اہل قرطبہ کا عمل مغرب کے بہت سے فقہاء کے نزدیک معیار تھا اس لیے کہ وہ علماء وقضاۃ کا مرکز بن گیا تھا، اس کے علاوہ لوگ ہمیشہ سے اپنے اپنے ملکوں کے دارالحکومت کو قابل حجت اور تہذیب کا آئڈیل سمجھتے ہیں، اس کی پیروی وتقلید میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس کو فیشن، تمدن، معاشرت کے اصول اور زندگی کے طور طریقوں کا سب سے بڑا مرکز سمجھتے ہیں، چنانچہ دعوت و اصلاح کا کام کرنے والوں کے لیے وہ وقت سخت کشمکش اور آزمائش کا ہوتا ہے، جب حاجی مرکز اسلام سے واپس آنے کے بعد یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو وہاں اس کے خلاف دیکھا ہے۔

اس سے زیادہ نازک اور اہم پہلو یہ ہے کہ بلدامین کو (تاریخ کے ہر دور اور تہذیب وتمدن اور معیارِ زندگی کے نشیب وفراز میں) اس سادگی وجفاکشی اور زہد واحتیاط کو کسی نہ کسی درجہ میں ضرور برقرار رکھنا چاہیے، جو دنیا کے کونہ کونہ سے آنے والے حجاج کو اس فضا اور اس ماحول سے کچھ قریب کردے جس فضا اور ماحول میں قرن اول کے مسلمان مناسک حج ادا کرتے ہیں، اس ماحول میں آخر ان کو محسوس ہو کہ وہ ایک نئے عالم میں قدم رکھ چکے ہیں، اور ایک بالکل نئے ماحول اور نئی فضا میں سانس لے رہے ہیں، یہ احساس و شعور ان کو گذشتہ زندگی کے سایہ سے ہٹا کر کچھ نئی چیزیں اور نئی قدریں قبول کرنے اور نئی دولت حاصل کرنے پر آمادہ کرسکے گا، اور ان کو وہ روحانی مسرت نصیب ہوگی جو ان کو اپنے گھر اور اپنے مستقر میں نہیں مل سکتی تھی، اب اگر بیت اللہ اور حرم شریف تو اپنی قدیم وضع پر باقی رہے، اور اس کے گردوپیش کی ہر چیز بالکل تبدیل ہو جائے اور یہ بلدامین اور اس کے قریبی شہر یورپ وامریکہ کا

ایک ٹکڑہ معلوم ہونے لگیں، اور مغربی تہذیب اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں اور اپنی تمام خرافات اور آلودگیوں کے ساتھ یہاں بھی مسلط ہو جائے، اور حاجی جس کو شرع کی زبان میں (الشعث التفل) یعنی ''غبار آلود اور پراگندہ بال'' کہا گیا ہے، جدید تہذیب کی تن آسانی اور وسائل کی فراوانی سے دل کھول کر لطف اندوز ہونے لگے، راحت و تنعم اور آسائش و آرائش کی بھرپور زندگی گزارنے لگے، جدید سے جدید تر سہولتوں اور وسائل میں ہر وقت ڈوبا رہے تو وہ کوئی ایسی نئی اور طاقتور چیز محسوس نہ کر سکے گا جو اس کی زندگی میں انقلاب لانے کی صلاحیت رکھتی ہو اور اس کے اندر سچی روحانیت پیدا کر سکتی ہو۔

اسی لیے حج کو جہاد ہی کی ایک قسم قرار دیا گیا ہے، بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: ''سب سے افضل اور سب سے اچھا جہاد حج مقبول ہے''، حضرت عائشہؓ ہی سے ایک اور روایت میں ہے، فرماتی ہیں کہ: ''میں نے کہا یا رسول اللہ ہم جہاد کو افضل عمل سمجھتے ہیں تو ہم کیوں نہ جہاد ہی کریں، آپؐ نے فرمایا؛ لیکن افضل جہاد حج مبرور (مقبول) ہے''، حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضورؐ سے روایت کرتے ہیں کہ: ''حج کا سامان اور تیاری کرو اس لیے کہ وہ بھی ایک جہاد ہے''۔

اس لحاظ سے اگر مکہ ہی پوری طرح بدل جائے اور مغربی تہذیب کو اس کی پوری معاشرت اور وسائل کے ساتھ قبول کر لے اور حج میں راحت و آسائش کے وہ سارے انتظام مہیا ہو جائیں جو صرف یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں پائے جاتے ہیں تو حجاج کو بجا طور پر ایک قسم کا روحانی خلاء ایک طرح کی بے کیفی و بے لطفی اور حج کے فوائد و اثرات میں کھلا ہوا انحطاط محسوس ہوگا۔

وحی الٰہی اور شریعت آسمانی نے حج کے لیے ایک ایسی سازگار فضا اور موافق ماحول فراہم کر دیا ہے جس میں سنجیدگی اور عزم خود بخود پیدا ہوتا ہے، اور دل و دماغ بیدار ہونے لگتے ہیں، اس نے اس کو عبادت و روحانیت اور تقدس کے حصار سے گھیر دیا ہے، حج کا سفر اکثر لوگوں کے لیے ایک طویل اور دور دراز کا سفر ہے، جس میں حاجی کو مختلف ملکوں، مختلف فضاؤں اور طرح طرح کے دلفریب مناظر اور فتنہ انگیز ترغیبات سے گزرنا ہوتا ہے، مختلف مشغولیتیں اور کاروباری فکری اس کو گھیرے رہتی ہیں، اس کی مدت کبھی کم ہوتی ہے کبھی زیادہ، وہ نئے نئے شہر میں داخل ہوتا ہے اور مختلف ملکوں کے لوگوں سے ملتا جلتا ہے، ان میں مرد بھی ہوتے ہیں، اور عورتیں بھی، جوان بھی اور بوڑھے بھی، کبھی وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ حج کرتا ہے اور اس کے بیوی بچے ہر جگہ اس کے ساتھ ہوتے ہیں، یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو حج کے تقدس اور رعب اور اس کی عظمت و شان اور عبادت و جہاد کی اسپرٹ کو ختم کر سکتی تھیں، اس صورت میں اس کا اندیشہ تھا کہ یہ سفر بھی ایک عام سفر یا پکنک اور تفریح بن جاتا، جہاں حاجی سیاح کی طرح جاتا اور تاریخی مقامات کی سیر کے بعد اسی طرح خالی ہاتھ واپس آتا۔

اس خطرہ کے سدباب کے لیے شریعت نے حج کو سنجیدگی اور تقدس کا ایک ایسا رنگ عطا کیا ہے جو کبھی اتر نہیں سکتا، اس نے اس کے چاروں طرف ایسی فصیل کھڑی کر دی ہے، اور ایسی حفاظتی خندقیں کھود دی ہیں جن کی وجہ سے غفلت و ذہول اور لایعنی اور فضول چیزوں کو اس کے اندر داخل ہونے کا موقع ہی نہیں ہے، اس کے لیے اس نے ایسے حکیمانہ اور دقیق احکام دیے ہیں جو زندگی پر حج کی گرفت کو مضبوط کرنے اور اس کو اصلاح و تربیت کے ایک رکن اور تقرب الی اللہ کے ذریعہ کی حیثیت سے باقی رکھنے کے پوری طرح ضامن اور ذمہ دار ہیں۔

اس نے سب سے پہلے اس کو اسلام کا چوتھا رکن قرار دیا ہے، اور جو اس کی شرطیں پوری کر سکے اس کے لیے اس کو ایک ایسا فریضہ قرار دیا ہے جس سے نہ کسی حالت میں صرف نظر کیا جا سکتا ہے، نہ اس کو کائی بدل ممکن ہے:

''وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا، وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ'' [سورۂ آل عمران: ۹۷] (اور لوگوں کے ذمہ ہے حج کرنا اللہ کے لئے اس مکان کا (یعنی) اس شخص کے ذمہ جو وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو، اور جو کوئی کفر کرے تو اللہ سارے جہاں سے بے نیاز ہے)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''جس کے پاس اس قدر زاد راحلہ ہوا کو بیت اللہ تک پہونچا سکے پھر بھی وہ حج نہ کرے تو وہ چاہے یہودی ہو کر مرے یا نصرانی''، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے رسول ہیں، اور نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا، اور حج کرنا جس کو اس کی استطاعت ہو''۔

لسانِ نبوت نے حج کی فضیلت اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے بلند درجہ کا بہت اہتمام اور تاکید کے ساتھ ذکر کیا ہے، اس لیے کہ اسی سے دل میں طلب و شوق اور ایمان و احتساب کے

جذبات پیدا ہوتے ہیں، اور جب تک یہ دونوں چیزیں کسی عمل کے ساتھ وابستہ نہ ہوں اور اس کا محرک نہ بنیں اس عمل میں اللہ کے نزدیک کوئی قیمت نہیں، حضرت ابوہریرہؓ سے ایک دوسری حدیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ’’جس نے اللہ کے لیے حج کیا اور بدکلامی وبدگوئی اور فسق وفجور سے اپنے کو محفوظ رکھا تو وہ ایسا ہو جائے گا جیسا اس دن تھا جس دن ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا‘‘، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ: ’’حج اور عمرہ کے درمیان متابعت کرو اس لیے کہ یہ دونوں حج مبرور کا بدلہ جنت سے کم کوئی چیز نہیں اور جب مومن احرام میں ہوتا ہے تو سورج غروب ہونے کے ساتھ اس کے تمام گناہ بھی زائل ہو جاتے ہیں‘‘، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ’’کوئی دن ایسا نہیں جس میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اتنی بڑی تعداد میں جہنم سے آزاد کرتا ہو جتنا عرفہ کے دن‘‘۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کون سا عمل افضل ہے، آپ نے فرمایا: ’’اللہ اور اس کے رسول پر ایمان، عرض کیا گیا اس کے بعد کیا؟ فرمایا: اللہ کے راستہ میں جہاد، دریافت کیا گیا اس کے بعد کون سا، فرمایا حج مبرور‘‘۔

ان دوررس اور حکیمانہ قوانین میں میقات حج کا تعین بھی شامل ہے، اس سے حاجی میں ایک نیا شعور اور فکری وروحانی بیداری ہوتی ہے، اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ شاہی دربار سے قریب ہو گیا ہے اور اس کی مقدس اور محفوظ حدود میں داخل ہو گیا ہے، اگر یہ مواقیت نہ ہوں تو حجاج بیت اللہ تک بلا کسی شعور واحساس کے اس طرح پہونچ جائیں جس طرح دیہاتی اور گنوار لوگ سلاطین وامراء کے دربار میں بلا سمجھے بوجھے گھس جاتے ہیں، اور ذلت کے ساتھ دھکے دے کر نکال دیے جاتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ مواقیت کی حکمت اور مختلف جہات سے آنے والوں کے لیے اس کی خاص جہت کے تعین کا راز بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’مواقیت کا اصل راز یہ ہے کہ چونکہ ایک طرف مکہ میں آشفتہ حال اور پراگندہ بال حاضر ہونے کی تاکید ہے، دوسری طرف اپنے شہر سے احرام باندھ کر سفر کرنے میں کھلی ہوئی دشواری ہے، کسی کا راستہ ایک ماہ کا ہے، کسی کی مسافت دو مہینے یا اس سے بھی زیادہ کی ہے، اس لیے مکہ کے اردگرد خاص مقامات متعین کر دیے گئے ہیں، جہاں سے احرام باندھنا ضروری ہے، اس کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے کہ یہ مقامات معروف ہوں اور عام گزرگاہوں کی حیثیت سے مشہور ہوں، اہل مدینہ کے لیے جو میقات (ذوالحلیفہ) ہے وہ نسبتاً سب سے زیادہ دور ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مدینہ وحی کا مرکز، ایمان کا قلعہ اور دارالہجرت ہے، اور پہلا شہر ہے، جس نے اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر ایمان قبول کیا، اس لحاظ سے اس کے باشندے اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ اعلاء کلمۃ اللہ میں سب سے زیادہ کوشاں اور عبادات میں سب سے آگے رہیں‘‘۔

جہاں تک احرام کا تعلق ہے، وہ حاجی میں شعور اور بیداری کرنے اور غفلت وذہول دور کرنے کے لیے ہے، وہ اس کے اندر یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ کسی بڑی مہم کو سر کرنے کے لیے جا رہا ہے اور سب سے مقدس شاہی دربار میں حاضر ہو رہا ہے، اس کے علاوہ اس میں مظاہر، اور مصنوعی آرائش وزیبائش سے بالکلیہ آزادی ہے، اس لحاظ سے یہ احرام حج کے لیے وہ حیثیت رکھتا ہے جو نماز کے لیے تکبیر تحریمہ، جو نمازی کو ایک نئی فضا میں پہونچا دیتی ہے، اور آزادی سے نکال کر تھوڑی دیر کے لیے قیود پابندی میں ڈال دیتی ہے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں:

’’حج وعمرہ میں جو احرام باندھا جاتا ہے، وہ نماز کی تکبیر تحریمہ کی طرح ہے، وہ اخلاص وتعظیم اور عزیمت مومن کی ایک ظاہری وعملی صورت آرائی ہے، اس کا مقصد لذتوں اور عادتوں اور آرائش وزیبائش کی تمام قسموں کو ترک کر کے نفس کو حقیر اور اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز وسرنگوں بنانا اور اللہ تعالیٰ کے لیے آشفتہ سری، پریشان حالی اور کلفت وتعب کا مظاہرہ کرنا ہے‘‘۔

اسی طرح احرام سے باہر آنے اور اس کے قیود واحکام سے رہائی پانے کے لیے بھی ایک خاص طریقہ مقرر ہے، جو نفس کو متنبہ اور بیدار رکھتا ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ حاجی احرام سے بالکل اچانک باہر آ جائے اور تمام چیزوں سے فوراً لطف اندوز ہونے لگے، وہ ایک خاص عمل اور نیت وارادہ کے ساتھ احرام اتارتا ہے، وہ نماز میں سلام کے ذریعہ اس کی فضا سے باہر آتا ہے، اور احرام میں حلق (یعنی سرمنڈوانے) کے ذریعہ، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں:

’’حلق کا راز یہ ہے کہ اس سے احرام سے نکلنے کا ایک ایسا طریقہ متعین ہوتا ہے، جو وقار کے منافی نہیں ہے، اگر لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو ہر شخص جو طریقہ چاہتا اختیار کر لیتا، اس کے علاوہ اس میں پراگندہ بال اور ژولیدہ سر ہونے کی حالت کا خاتمہ ہے جو پہلے مطلوب تھی، یہ ایسا ہے جیسا نماز میں سلام پھیرنا‘‘۔

اس کے علاوہ حج کو مفید ومؤثر بنانے کے لیے

جو اقدامات وانتظامات کیے گئے ہیں، ان میں ''تلبیہ'' بھی داخل ہے جس کی شریعت میں بہت ترغیب آئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ سے زیادہ بلند آواز کے ساتھ تلبیہ کو مستحسن قرار دیا ہے، آپ سے دریافت کیا گیا کہ: ''کن ساج افضل ہے؟'' آپ نے فرمایا: "العج والثج" (بلند آواز سے تلبیہ اور قربانی کے خون بہانے کی کثرت)۔

نفس کو بیدار وہشیار اور مقاصد حج سے آشنا اور آگاہ رکھنے میں اور اس کو ایمان ومحبت، ذوق وشوق اور اللہ تعالیٰ کے دربار عالی میں جبہ سائی اور ناصیہ فرسائی کے جذبات وکیفیات سے مست وسرشار کرنے میں تلبیہ کا بڑا حصہ ہے، اس سے حاجی کے جسم وجان اور اعصاب میں ایمان وروحانیت کا کرنٹ اس طرح طاقت اور تیزی کے ساتھ دوڑ جاتا ہے، جس طرح برقی لہر تاروں میں وہ اس کو اسلام کے اس رکن عظیم (حج) کے لیے تیار کرتا ہے جس کی طلب واستعداد، احساس وشعور اور اہتمام وتیاری کا موقع اس کو بعض اوقات نہیں ملتا، جب وہ "لَبَّیْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّیْكَ، لَبَّیْكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ لَبَّیْكَ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ، لَا شَرِیْكَ لَكَ" کی صدا لگاتا ہے تو حج کے بلند مقاصد اور اس کی روح اور اسپرٹ اس کے سامنے پوری رعنائی ودلربائی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے، صبر وضبط کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، اور محبت وشوق کا ساغر بے ساختہ چھلکنے لگتا ہے، توحید کا شعلہ اس کی رگوں میں آتش سیال کی طرح دوڑ جاتا ہے، اور اس کے سارے وجود کو بے قرار وسیماب وش بنا دیتا ہے، اور وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ (علیہ السلام) اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرام اور حاملین دعوت کے ساتھ فکری وروحانی طور پر وابستہ ہو جاتا ہے، اور ان کی جماعت میں گھل مل جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حج کو دو حرمتیں یا دو عزتیں اور خصوصیتیں عطا کی ہیں، زبان کی حرمت اور مکان کی حرمت، اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس رکن عظیم کی عظمت وجلال اور اپنی ذمہ داری اور فرض منصبی کا استحضار اور احساس حاجی کے کے اندر پوری قوت کے پیدا ہو جاتا ہے، اور وہ اپنی تمام نقل وحرکت اور قیام وسفر میں ذکی الحس، حاضر دماغ اور بیدار وہوشیار رہتا ہے، اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس روحانی فضا سے غافل اور بے پرواہ نہیں ہوتا جو اس کے گرد وپیش میں محیط ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اِثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ، ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ، فَلَا تَظْلِمُوْا فِیْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ'' [سورۂ توبہ:۳۶] (بیشک مہینوں کا شمار اللہ کے نزدیک بارہ ہی مہینہ میں کتاب الٰہی میں (اس روز سے) جس روز کہ اس میں آسمان اور زمین پیدا کیے اور ان میں سے چار (مہینہ) حرمت والے ہیں یہی دین مستقیم ہے سو تم ان (مہینوں) کے باب میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

''یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْهِ، قُلْ قِتَالٌ فِیْهِ كَبِیْرٌ'' [سورۂ بقرہ:۲۱۷] (اور آپ سے حرمت والے مہینہ کی بابت (یعنی) اس میں قتال کی بابت دریافت کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ اس میں قتال کرنا بڑا (گناہ) ہے)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''بیشک زمانہ اپنی اصل شکل پر لوٹ گیا ہے، جس دن اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین پیدا کیے ان میں چار حرمت والے مہینے ہیں، ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب مُضَر جو جمادیٰ اور شعبان کے درمیان ہے''۔

جہاں تک مکان کی حرمت کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِیْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَیْءٍ، وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ'' [سورۂ نمل:۹۱] (آپ کہہ دیجیے) مجھے تو یہی حکم ملا ہے کہ میں عبادکروں اس شہر کے مالک (حقیقی) کی جس نے اسے محترم بنایا ہے، اور سب چیزیں اسی کی ملک ہیں، اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں فرماں بردار ہوں)۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر فرمایا کہ: ''آج سے ہجرت نہیں لیکن جہاد اور نیت باقی ہے، اور جب تمہیں دین کے لیے پکارا جائے تو فوراً نکل کھڑے ہو''، آپؐ نے فتح مکہ کے دن یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: ''اس شہر کو اللہ تعالیٰ نے اسی دن سے حرمت بخشی ہے، جس دن اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس لیے اللہ تعالیٰ کی یہ حرمت اس کے ساتھ قیامت تک وابستہ ہے، مجھ سے پہلے بھی کسی کے لیے اس میں جنگ جائز نہیں ہوئی اور میرے لیے بھی صرف دن کی ایک گھڑی کے لیے اس کی رخصت ملی ہے، اب یہ قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ کی حرمت کے ساتھ حرام ہے، نہ اس میں کوئی کانٹا یا تنکا توڑا جاسکتا ہے، نہ شکار ہنکایا جاسکتا ہے، نہ اس کی گری ہوئی چیز اٹھائی جاسکتی ہے، ابن عباسؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا اذخر بھی؟ اس لیے کہ لوگوں کے لیے اس کی ضرورت پڑتی ہے، آپؐ نے فرمایا کہ: ہاں سوائے اذخر کے''۔

حرم میں معصیت یوں بھی سخت چیز ہے لیکن

بعض علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ حرم میں ارادۂ معصیت بھی معصیت میں داخل ہے، بخلاف دوسری جگہوں کے، وہ اس کے ثبوت میں یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

"وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ ۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ" [سورۂ حج:۲۵] (اور جو کوئی بھی اس کے اندر کسی بے دینی کا ارادہ ظلم سے کرے گا ہم اسے عذاب دردناک چکھائیں گے)۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ حرم کی خصوصیت ہے کہ یہاں ظلم کا ارادہ کرنے والا بھی قابل مواخذہ اور لائق عتاب ہے خواہ وہ اس ارادہ کو عملی جامہ پہنا سکے یا نہیں۔

زمان ومکان کی حرمت کے ساتھ احرام کی حرمت کے بھی بہت سے احکام اور خصوصی آداب ہیں، مثلاً حالت احرام میں شکار کی ممانعت اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ" [سورۂ مائدہ:۹۵] (اے ایمان والو شکار کو مت مارو جب کہ تم حالت احرام میں ہو)۔

دوسری جگہ آتا ہے:

"اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ، وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا، وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ" [سورۂ مائدہ:۹۶] (تمہارے لیے دریائی شکار اور اس کا کھانا جائز کیا گیا تمہارے نفع کے لیے اور قافلوں کے لیے اور تمہارے اوپر جب تک تم حالت احرام میں ہو خشکی کا شکار حرام کیا گیا، اللہ سے ڈرتے رہو جس کے پاس جمع کیے جاؤ گے)۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں:

''ان اشیاء کی ممانعت محرم یعنی احرام باندھنے والے کے لیے ہے کہ تذلل، ترک تجمل، پراگندہ بال اور غبار آلود ہونے کی کیفیت حاصل ہو، اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور خوف کا غلبہ اور مواخذہ کا ڈر اس پر غالب رہے، اور وہ اپنی خواہشات اور دلچسپیوں میں پھنس کر نہ رہ جائے، ان ممنوعات میں شکار اس لیے شامل ہے کہ وہ بھی ایک قسم کے توسع میں داخل ہے، اور دلچسپی اور تفریح خاطر کی چیز ہے''۔

حج کا سفر اکثر اوقات ایک طویل سفر ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ" [سورۂ حج:۲۷] (اور لوگوں میں حج کا علان کردو، لوگ تمہارے پاس پیدل بھی آئیں گے اور دُبلی اونٹنیوں پر بھی جو دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی)۔

اس میں انسان کو مختلف حالات پیش آتے ہیں، مختلف لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، نئے نئے لوگوں کی طویل عرصہ تک صحبت ورفاقت رہتی ہے، طرح طرح کے معاملات سامنے آتے ہیں، اور یہ سب چیزیں بہت سے ممنوعات، غلط قسم کی ترغیبات اور ایک دوسرے کے ساتھ کشمکش اور لڑائی جھگڑے کی حد تک پہونچا سکتی ہیں، حاجی اس سفر میں بہت سی چیزوں سے تنگ دل ہوتا ہے، بعض اوقات کسی ناگوار بات سے اس کی طبیعت میں سخت اشتعال پیدا ہوتا ہے، اور اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں بعض اوقات اس سے ایسی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں جن کو وہ اپنے وطن اور اپنے گھر میں بھی برا سمجھتا تھا، اور حتی الامکان ان سے بچتا تھا، وہ بعض ایسی مصیبتوں اور اخلاق قبیحہ میں گرفتار ہو جاتا ہے جو حج کی روح اور مقاصد کے یکسر منافی ہیں، حج میں ان چیزوں کی ممانعت خاص طور پر اسی لیے آئی ہے کہ اس میں اس کا احتمال اور بڑھ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ، فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ، وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ، وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى، وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ" [سورۂ بقرہ:۱۹۷] (اہم حج کے (چند) مہینے معلوم ہیں، جو کوئی ان میں اپنے اوپر حج مقرر کرے تو پھر حج میں نہ کوئی فحش بات ہونے پائے اور نہ کوئی بے حکمی اور نہ کوئی جھگڑا اور جو کوئی بھی نیک کام کروگے، اللہ کو اس کا علم ہو کر رہے گا، اور زادِ راہ لے لیا کرو، اور بہترین زادِ راہ تو تقویٰ ہے، سوائے اہل فہم! میرا ہی تقویٰ اختیار کیے رہو)۔

ان قوانین، احکام اور تعلیمات (جن کا تعلق قلب وجوارح، نیت وعمل اور زمان ومکان سے براہ راست ہے) حج کو تقدس وطہارت، تورع وزہد، مراقبہ وحضور، محاسبۂ نفس اور مجاہدہ وجہاد کی ایک ایسی خلعت عطا کی ہے جو دوسرے مذہبوں اور ملتوں کے اس قسم کے اعمال میں ہرگز نہیں ملتی، ان کی وجہ سے نفس انسانی، اخلاق عامہ اور نظام زندگی پر جو اثرات پڑتے ہیں اس کو دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث قدسی کی تصدیق ہوتی ہے:

مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ (جس نے خالص اللہ کے لیے حج کیا اور پھر دوران حج نہ بری بات زبان سے نکالی نہ فسق وفجو اختیار کیا تو ایسا ہو کر لوٹا جیسا کہ اس کی ماں نے اسے جنا تھا)۔

☆☆☆☆☆

پیامِ توحید

عید قرباں دنیا کے اول المسلمین کی یادگار

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

"لبیك اللّٰھم لبیك، لبیك لا شریك لبیك" حاضر ہے، اے میرے آقا اور مولا! آپ کا یہ بندہ حاضر ہے، یہ گواہی دیتا ہے کہ آپ ہر طرح کی شرکت سے ماوراا ور برتر ہیں۔

روحانیت کی دنیا میں بہار کا موسم آ گیا، کعبہ اسلام کا جغرافیائی مرکز ہے، اس کے جشن کا دن آ گیا، دور دور سے، یورپ سے اور پچھّم سے، اتر سے دکھن سے کھنچ کھنچ کر قافلے پر قافلے چلے آ رہے ہیں، بوڑھے بھی، جوان بھی، لاغر بھی، اور پہلوان بھی، گورے بھی، کالے بھی، عالم، فاضل، کامل بھی، نادان، ان پڑھ، جاہل بھی، پیدل اور سواریوں پر، اونٹوں اور موٹروں اور لاریوں پر، اسلامی قمری سال کے بارہویں مہینہ ذی الحجہ یا بقرعید کا پہلا ہفتہ آیا کہ ہزاروں بلکہ لاکھوں کا جماؤ ہو گیا، مکہ کی گلیوں میں، حرم شریف کے لق ودق صحن اور بڑے بڑے دالانوں میں، لبیک لبیک کی صدائیں ہر طرف بلند، ہر بلندی پر چڑھتے ہوئے، ہر پستی میں اترتے ہوئے، سواری پر سوار ہوتے ہوئے، مسجد کا رخ کرتے ہوئے، ہر طرف یہی ذکر، یہی فکر، احرام کی چادریں شانوں پر، توحید کے نعرے زبانوں پر، ۸ر تاریخ سے لے کر ۱۳ر تک، مکہ کی گلیوں، عرفات اور مزدلفہ میں حاجیوں کا ہجوم، تکبیر وتہلیل، طواف وقربانی کی دھوم، زائروں کا ازدحام، ابھی کوچ، ابھی مقام، صفا ومروہ کے درمیان لپکتے جاتے ہیں، دوڑتے جاتے ہیں، عرفات کے چٹیل میدانوں میں اپنے گناہوں کو یاد کرتے جاتے ہیں، گڑگڑاتے جاتے ہیں، کعبہ کے گرد گھوم رہے ہیں، چکر پر چکر لگا رہے ہیں، منیٰ میں قربانیاں کر رہے ہیں، شیطان کے مجسموں پر کنکریاں برسا رہے ہیں، توحید کا کلمہ ہر حال میں پڑھتے ہوئے، رب کا نام ہر آن جپتے ہوئے، یہ احکام ہوئے مرکز تک پہنچ جانے والے خوش نصیبوں کے۔

"اللّٰہ أکبر اللّٰہ أکبر لا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ أکبر اللّٰہ أکبر وللّٰہ الحمد".

بڑائی آپ میں ہے، صرف آپ میں ہے، کوئی آپ کے سوا معبود نہیں، کوئی آپ کے سوا مقصود نہیں، بڑے صرف آپ ہیں، آپ ہیں، کمالات ہر قسم کے جمع ہیں، صرف آپ کی ذات میں، آپ کی صفات میں، ۹ر تاریخ کی فجر کی نماز سے یہ تسبیح شروع ہو گئی اور جاری رہے گی، اس کی گونج ہر فرض نماز کے بعد ۱۳ر کی عصر تک، گویا ۲۳ر نمازوں کے ساتھ اور دس تاریخ کی صبح کو سب چھوٹے بڑے مل کر عید کی نماز پڑھیں گے، شہر سے باہر عیدگاہ میں اور اس نماز میں بھی، ہر مرتبہ سے کئی کئی زائد تکبیر کہیں گے، جسم کی صفائی کے ساتھ، لباس کی ستھرائی کے ساتھ نماز پڑھنے جائیں گے، امیر وغریب، آقا وخادم ایک دوسرے کو گلے لگائیں گے، روح کی بالیدگی کے ساتھ، قلب کی پاکیزگی کے ساتھ واپس آئیں گے، اللہ کا نام پکارتے جائیں گے، توحید کی منادی کرتے آئیں گے، یہ کون بتائے کیا کیا مانگیں گے، کیا کیا پائیں گے، کیسی کیسی دولت اپنے ساتھ لائیں گے، پیسے والے قربانیاں کریں گے اور زبان کی لذتوں میں، خوان کی نعمتوں میں اپنے سے بھی پیشتر مفلسوں، غریبوں، عزیزوں، قریبوں کا حصہ نکال رکھیں گے، یہ آداب ہوئے مرکز سے دور عالم اسلام کے گوشہ گوشہ میں رہنے والوں، بسنے والوں کے، آج جشن ہے کعبہ کا، دین توحید کے مادری مرکز کا، اس میں شرکت سے محروم نہ پاس والے ہیں، نہ دور والے۔

کہتے ہیں کہ آج سے قبل، بہت قبل جہاں آج ملک عراق ہے، وہاں ایک ملک آباد تھا کالڈیا کلدانیہ نام کا، اپنے وقت کا مہذب اور متمدن، اس کے مہذب ترین اور متمدن ترین شہر اور پایہ تخت کا نام تھا اُور، اس کا پورا پتہ آج کے نقشہ میں چلانا ہو تو عالم خیال میں خلیج فارس سے بغداد کی طرف چلیے، آپ چلے، لیجیے اب آدھا فاصلہ طے کر چکے، اب دریائے فرات آپ کے بائیں ہاتھ پر ہے، کوئی دس میل کے فاصلہ پر آپ اُور کے کھنڈروں میں پہنچ گئے، یہیں ایک شریف اور معزز گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا، نام ابراہیمؑ رکھا گیا، یا حسب روایت توریت پہلے ابرام اور پھر ابراہام، سال پیدائش آرکیالوجی (اثریات) کے مشہور ماہر سر چارلس مارسٹن کی تحقیق کے مطابق ۲۱۶۰ قبل مسیح تھا یعنی آج سے ٹھیک چار ہزار ایک سو سال قبل۔

فنون لطیفہ میں نقاشی اور سنگ تراشی جو درجہ آج رکھتے ہیں وہی اس قت بھی حاصل تھا کہ یہ فنون تو لوازم تمدن میں سے ہیں، مذہب شرک

تھا، پرانی اصطلاح میں، یا خداؤں کا تعدد حال کی بول چال میں، اثریات عراق کے ایک اور ماہر سرلیونارڈ وِڈلی کا بیان ہے کہ ”اُور کا مذہب جلی ترین شرک تھا“، جن دیوتاؤں کے نام ہم تک پہونچے ہیں، ان ہی کی تعداد پانچ ہزار ہے۔

سنگ تراشی کو بت تراشی میں تبدیل ہوتے کیا دیر لگتی ہے، بچہ کے والد کا نام توریت میں آیا ہے تارح اور قرآن میں آذر، خود ایک بڑے آرٹسٹ (صناع) تھے اور خاص آرٹ یا صنعت سنگ تراشی اور بت گری تھی، پتھر کی مورتیں اس کاریگری، اس ہنرمندی سے بناتے کہ دیکھنے والے واہ واہ کرنے لگتے، بچہ کی فطرت سلیم تھی، جسم کی آنکھ نے یہ منظر دیکھا تو بغاوت کی ٹھان لی، روح کی آنکھ نے توحید کی جھلک دکھادی، ضمیر کی آسمانی قوت نے غیب کا اشارہ پا، زبردست روحانی انقلاب کی ٹھہرالی، اٹھے، بڑھے، بولے، پہلے ہنسے گئے، پھر ستائے گئے، ہٹائے گئے، وطن چھوڑ، رخ مغرب کی جانب کیا، شام پہونچے، فلسطین کی وادیاں طے کیں، مصر کی سرزمین چھانی، قدم اس ملک میں رکھا جو خشک تھا اور ایک ریگستان بے آب وگیاہ آسمانی روشنی کی ایک تڑپ نے نشاندہی کی، یہی تو وہ زمین ہے جس کے لیے ازل سے رشک آسمان ہونا، کائنات انسانی کا روحانی مرکز بننا طے ہو چکا ہے، سیاحی کے قدم رک گئے، مسافرت نے وطن گزینی کی شان پیدا کرلی، مصری بیوی شہزادی تھیں، ان سے صاحبزادے تولد ہوئے، نام اسمٰعیل رکھا گیا، پرورش لاڈ سے، پیار سے ہوئی، پلے بڑھے، بڑے ہوئے، باپ کے ہاتھ بٹانے، ماں باپ کے کام آنے لگے، اِدھر زمین پر یہ ہو رہا تھا، اُدھر باپ کو خواب میں حکم آسمان والے کا ملا کہ بیٹے کو ہماری راہ میں قربان کردو، یہ ٹھیک ہے کہ انسانی قربانی کا دستور اس وقت عام تھا، دیویوں اور دیوتاؤں کے استھانوں پر انسانوں کی بھینٹ آئے دن چڑھتی رہتی تھی، لیکن بیٹے اور اکلوتے بیٹے کی قربانی کس باپ نے کی تھی؟

فرمائش کس باپ سے ہوئی تھی؟ ابراہیمؑ مرحلے عشق ومحبت کے بہت سے طے کئے ہوئے اور کڑیاں عبدیت اور عبودیت کی بہت سی جھیلے ہوئے، امتحان کامیابی کے ساتھ بہت سے دیے ہوئے تھے، یہ آزمائش سب سے بڑی، سب سے کڑی تھی، ایسا امتحان تو صرف ایک موحد کا ہوسکتا ہے، یہ ہمت، یہ جیوٹ، یہ حوصلہ صرف ایک موحد ہی کرسکتا تھا۔

اللہ اللہ! قیامت کی تھی وہ گھڑی، جب بوڑھے یا اس وقت کی اوسط عمر کے حساب سے ادھیڑ عمر کے باپ نے اکلوتے نورنظر کو، نوجوان سبزۂ آغاز، لخت جگر کو زمین پر لٹایا، اپنی آنکھ پر پٹی باندھی اور چھری چلادی، ابراہیمؑ نے دعوے کا اعلان کیا تھا، کہا تھا اور جب کائنات کی ساری فضا مشرکانہ تھی، اس وقت کہا تھا کہ میں موحد ہوں، مسلم ہوں، میں اپنا سب کچھ سونپ چکا ہوں اپنے مالک ومولا کو، اپنے کو فنا کرچکا، میرا اپنا کچھ بھی نہیں، نہ جان اپنی، نہ اولاد اپنی، سب کچھ اسی پاک بے نیاز کی ہے، امتحان اسی دعوے کا تھا۔

چھری چلی، لیکن اسمٰعیلؑ کے حلقوم پر نہیں، ایک دنبہ کے گلے پر، امتحان عاشق صادق کا، بندہ مسلم وفرمانبردار کا ہو چکا، ایک دنبہ غیب سے لاکر اسمٰعیلؑ کی جگہ پر رکھ دیا گیا تھا، بشارت ملی کہ تمہاری قربانی قبول ہوگئی، اسی مقبولیت کی یادگار دنیا میں مستقل اور پائدار کردی جائے گی۔

جشن آج کعبہ کا ہو رہا ہے، یہ ہفتہ ہفتہ کعبہ منایا جارہا ہے، کیسے ممکن تھا کہ یاد تعمیر کعبہ کی دلائی جاتی اور معمار کعبہ کو بھلادیا جاتا، ابراہیمؑ توریت اور قرآن دونوں کی زبان میں اللہ کے دوست اور خلیل، وہ تھے کہ انہوں نے اور ان کے جگر گوشہ اسمٰعیلؑ نے مل کر کعبہ کی دیواریں بنائی تھیں، بنیادیں اٹھائی تھیں، پتھروں کی ڈھلائی کی تھی، جڑائی کی تھی، عمارت جب تک زندہ ہے معمار بھی مردہ نہ ہونے پائے گا، نہ اس کا کام، نہ اس کا نام، روایتوں میں آتا ہے کہ واقعہ قربانی کے وقت حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر ۱۳؍سال اور ان کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیمؑ کا سن ۸۶؍سال کا تھا، یہ دونوں حساب اگر صحیح ہیں تو ۲۱۶۰ سے ۹۹؍سال گھٹادیجیے، اور واقعہ قربانی کی تاریخ آکر ۲۰۶۱ قبل مسیح ٹھہرتی ہے، یعنی آج سے چار ہزار ایک سو سال قبل۔

وہ دن ہے اور آج، کہ اُدھر سال کی وہ قمری تاریخ آئی اور اِدھر ملت ابراہیمی کا نام لیوا مسلمان روئے زمین کے جس حصہ پر بھی آباد ہوا، قربانی کے جانور کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، جانور اچھے سے اچھا ڈھونڈ کر لائے گا، جانور حرام نہ ہو، گندہ نہ ہو، اندھا نہ ہو، لولا لنگڑا نہ ہو، حلال ہو، پاکیزہ ہو، تندرست ہو، بھلا چنگا ہو، جانوروں میں بھی شرافت کا ایک معیار ہوتا ہے، شریعت نے شرافت خاندانی صرف چند جانوروں کی معتبر مانی ہے اور وہ معروف ومعلوم ہیں، ان میں سب سے بڑا جانور اونٹ اور سب سے چھوٹا بکری، مسلمان انہیں اچھے داموں، اپنی حلال، پاکیزہ کمائی سے خرید کر لائے گا، کھلائے گا، پلائے گا، اپنے سے ہلائے گا اور جب وقت آجائے گا تو.............

..................بقیہ صفحہ ۱۷؍ پر

عروج وزوال

مسلمان اپنے کو اللہ کی مرضی کے تابع بنائیں!

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

مسلمانوں کی تاریخ عظیم رہی ہے، انھوں نے جو عظمت حاصل کی وہ محض عظمت ہی نہیں تھی، اس کا راز یہ تھا کہ وہ ایک سیدھی سادی اور سچی زندگی گزارنے کے عادی تھے۔

کائنات کا سارا نظام اللہ کا مقرر کیا ہوا ہے، اور اس کے سامنے چل رہا ہے، اللہ تعالیٰ جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اس کے اسباب مہیا کر دیتا ہے۔ اسلام کے فیضان کو وجود میں لانے کے لیے ضرورت تھی کہ اس میں کسی چیز کی آمیزش نہ ہو، لہٰذا جس وقت اسلام آیا ہے اس وقت ایک طرف رومی حکومت تھی جس کی ایک تہذیب، تمدن اور معیار تھا، دوسری طرف ساسانی حکومت تھی۔ دونوں کے پاس علم، تمدن، تہذیب، عسکری طاقت اور انتظامی صلاحیت سبھی کچھ تھی، علم وادب میں طاق تھے، طاقتور بھی تھے، اور ساری دنیا میں ان کا دبدبہ بھی تھا۔ وہ روس اور امریکہ کی طرح سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور طاقتور قومیں تھیں۔ ان کے درمیان عرب تھے جو بالکل ان پڑھ تھے، علم سے جو قابلیت اور صلاحیت پیدا ہوتی ہے اس سے ناواقف تھے، ہاں ایک نئے دین اور نئے پیغام کو پہنچانے کے لیے جو فطری صلاحیتیں ہوتی ہیں وہ ان میں تھیں، اسلام انھوں نے قبول کیا، ان کی ساری ترقی اسلام کے سائے میں ہوئی۔

اسلام کا پیغام پہنچانے اور اس کی ذمہ داری کو اٹھانے کے لیے عربوں نے علم سیکھا، اور ڈیڑھ دوسو برس کے اندر دنیا میں سب سے زیادہ علم عربوں کو حاصل ہو گیا۔ ان کو سائنس کے علوم کی جو واقفیت اور صلاحیت حاصل ہوئی اس کی بدولت وہ دنیا میں منفرد ہو گئے، علم سے ایسا آراستہ ہو گئے کہ دنیا کی ساری قومیں ان سے نیچے ہو گئیں، اور ان سے پیچھے ہو گئیں۔

سات سو سال تک مسلمانوں نے بغیر کسی حریف کے علمی زندگی گزاری ہے، چاہے وہ سائنسی میدان میں ہو، یا دوسرے علوم میں جو ان کی زندگی سے تعلق رکھتے تھے، اس میں انھوں نے کمال پیدا کیا۔ آج بھی میڈیکل اور دیگر سائنس کے بہت سے شعبوں کا علم مسلمانوں کا رہین منت ہے، اس طرح پانچ سو سال تک عرب علمی زندگی میں منفرد اور قائد رہے۔

لیکن زوال اس طرح شروع ہوا کہ مسلمانوں نے علم پر توجہ دینا چھوڑ دیا اور سمجھ بیٹھے کہ جو عزت انہیں حاصل ہے وہ ہمیشہ رہے گی، جب کہ دوسری قوموں نے ترقی کرنا شروع کیا۔

پورے عالم میں مسلمانوں کو ہر طرف سے نشانہ بنایا جا رہا ہے، مختلف طریقوں سے ان کی شبیہ کو مسخ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، خاص طور سے ذرائع ابلاغ کو استعمال کر کے اور لٹریچر کے ذریعہ مسلمانوں کی شبیہ کو مسخ، ان کی اچھی باتوں کو بری باتیں، اور نیکی کو بدی قرار دیا جا رہا ہے۔ انہیں تخریب پسند کہا جا رہا ہے اور یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ اگر ان کو چھوٹ ملے گی تو دنیا اور انسانیت کو تباہ کر دیں گے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ساری دنیا کی ترقی کا خواہش مند ہے، تباہ کرنا تو دور کی بات ہے، اسلام ترقی دینے سنوارنے کے لیے آیا ہے۔ جب تک دنیا کی قیادت، طاقت، سطوت اور علم مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا انھوں نے دنیا کو مالا مال کر دیا۔

مسلمان بہت سے ملکوں میں پہنچے، جہاں لوگ جانوروں کی طرح زندگی گزارتے تھے، جنہیں تہذیب اور انسانیت سے روشناس کرایا، آدمی بننے کا سلیقہ سکھایا؛ لیکن آج یہ سمجھا جا رہا ہے کہ مسلمان بدسلیقہ ہیں، گندے ہیں، جاہل ہیں، بری حرکتوں میں مبتلا ہیں، ایسے دلائل اور ایسی شہادتیں ان کی خلاف دی جا رہی ہیں جو قابل تحقیق ہیں۔

الحمد للہ مسلمانوں میں شعور بیدار ہو چکا ہے، وہ زندہ رہنے، باقی رہنے اور اپنی عظمت کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان زندہ ہیں اور زندگی کے سبب رواں دواں ہیں، جو راستے پر چلیں گے وہ منزل پر پہنچ جائیں گے۔ ہر جگہ مسلمانوں کا شعور بیدار ہو چکا ہے، جو اصحاب شعور اور جذبے کے مالک ہیں وہ ماضی کی عزت اور عظمت کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔

اخبارات اٹھا کر دیکھئے تو انسان کا سینہ چوڑا ہوتا ہے، محنتوں اور صلاحیتوں کے واقعات سامنے آ رہے ہیں، نتیجہ کب نکلے گا، یہ مستقبل کی بات ہے۔

حوصلہ انقلاب لاتا ہے، ایک عیسائی حکمراں کی بات جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہوئی تھی، صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کے دل کو لگ گئی، سمجھداری اور حکمت سے کام لیا، دنیا بدل گئی اور بیت المقدس مسلمانوں کو واپس مل گیا، اس دور میں جو خبریں مل رہی ہیں کچھ مشکل نہیں کہ مستقبل شاندار ہو اور عظمت واپس آئے۔ ضرورت ہوشیاری اور سمجھ داری کی ہے۔

بڑی طاقتیں جن کے ہاتھ میں دنیا کی باگ

ڈور ہے ایسے انتظام کر رہی ہیں کہ مسلمان آگے نہ بڑھ سکیں۔ مسلمان اب تک علم میں پیچھے ہیں، تعلیم کا فیصد مسلمانوں میں بہت گرا ہوا ہے، مسلمانوں کا علم سے بہت گہرا تعلق ہے، مگر انھوں نے اس تعلق کو ختم کر دیا، مسلمانوں کو گرانے اور غلط فہمی پیدا کرنے اور غلط انسان بنا کر پیش کرنے میں لوگ لگے ہوئے ہیں۔

ملک سیکولر ہے، حکومت مسلمانوں اور اسلام کی سرپرستی نہیں کر رہی ہے، ہم نہ تو مطالبہ کر سکتے ہیں، نہ توقع کرنی چاہیے، نہ ان کو امت کے مسائل کی مدد کرنی ہے، اور نہ وہ کریں گے، خاص طور سے تعلیم کے مسئلہ میں۔

تعلیم آدمی کو آدمی بناتی ہے، اس سے صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں، ملک کی طرف سے جو تعلیم دی جا رہی ہے، وہ ہم کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے والی تعلیم ہے، ضرورت ہے کہ نئی نسلوں کو ایسی تعلیم دلوائیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو استعمال کر سکیں۔

حکومت جو تعلیم دے گی وہ سیکولر ہوگی، یا دوسرے کسی مذہب کی تعلیم ہوگی، تھوڑی بہت کوشش کر کے کم سے کم ایسی بنیادی تعلیم تو دی جائے کہ دین تو باقی رہے، اللہ، رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تو پہچانتے رہیں، نئی نسل جانے گی نہیں تو کیسے سیکھے گی، تعلیم کی فکر کرنی چاہیے۔

جب تک ہم اس کی فکر نہیں کریں ترقی نہیں کر سکتے۔ تعلیم یافتہ تو ہو جائیں گے؛ لیکن مسلمان نہیں رہیں گے، مسلمان مسلمان نہیں رہے گا تو امت ہی ختم ہو جائے گی، اس وقت میڈیا پر یہودیوں کا قبضہ ہے، اقتصادیات پر یہودیوں کا قبضہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودی لڑکے علم کے پیچھے پاگل ہو رہے ہیں۔

ہم اردو زبان کو سنبھال نہیں سکتے، جو نسلیں فکر کرتی ہیں وہ طاقتور ہوتی ہیں، جو کوتاہی ہے وہ ہماری کوتاہی ہے، اردو تعلیم کی خاص طور سے فکر کرنی ہے تاکہ ہمارے متعلق درست رائے قائم ہو، اسلام کی طرف سے عورتوں کی تعلیم کی بہت اہمیت بتائی گئی ہے۔ ذرائع ابلاغ اور لٹریچر کی بڑی اہمیت اور ضرورت ہے، اس میں مسلمانوں نے بڑی غفلت کی ہے۔

ذرائع ابلاغ نے مسلمانوں کو کمتر اور ذلیل کر کے پیش کیا، مسلمانوں کے عقائد اور افکار پر اٹیک کیا گیا ہے، مثال کے طور پر ایک مصنف نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ایک کتاب بہت اچھے انداز میں لکھی؛ لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا ایک اچھے لیڈر کی طرح عربوں کی معاشرتی حالت درست کرنے کے لیے کیا، اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے واقعات ہیں وہ ایک بہترین لیڈر کی حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوشش کی وجہ سے ہیں، اس طرح وہ نبوت کی خصوصیت ختم کرنا چاہتا ہے، پڑھنے والا گمراہ ہوگا اور سمجھے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف ہو رہی ہے، جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبی تھے جو اللہ کا مقرر کردہ ہوتا ہے، جب کہ لیڈر کو افراد بناتے ہیں، اس طرح اسلام کی شبیہ کو بگاڑا جا رہا ہے۔

ہندوستان کے اخبارات میں مسلمانوں کی شرافت، عزت اور عظمت نیز جو مسلمانوں کی اچھی چیزیں ہیں ان کو دبا کر رکھا جاتا ہے، جو نقائص ہیں ان کو اچھالا جاتا ہے۔

کلکتہ میں مسلمانوں کا جلسہ ہوا جس میں سات لاکھ افراد اکٹھا ہوئے، ایک انگریزی اخبار میں خبر آئی کہ چند سو مسلمان جمع ہوئے، یہ طریقہ بہت سمجھداری سے اختیار کیا جا رہا ہے۔

ذرائع ابلاغ سے ہمارے متعلق لوگ صحیح بات نہیں سمجھ سکتے، اقتصادیات اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ذہنوں کو بدل دیا گیا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ ہر مسلمان جیب میں چاقو رکھتا ہے، اور مسلمان کا کام یہ ہے کہ دوسروں کو ذبح کرتا ہے۔

ہمارے پاس ذرائع ابلاغ نہیں، ہم وہ لٹریچر نہیں پیدا کر پا رہے ہیں جس سے دوسروں کو سمجھا سکیں، اور اسلام کی خوبیوں کو سامنے لا سکیں، پڑوسیوں اور غیر مسلموں میں جو غلط فہمیاں ہیں، ان کو سن کر حیرت ہوتی ہے، ذرائع ابلاغ کے ذریعے غلط فہمیاں پیدا کی جاتی ہیں۔

مسلمان اپنے کو اللہ کی مرضی کی تابع بنائیں، فرشتوں نے اللہ سے کہا کہ ہم اتنا ہی جانتے ہیں جتنا آپ نے ہمیں بتایا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''ہم نہ کہتے تھے کہ ہم اپنا خلیفہ بنائیں گے اور اسے علم وشعور عطا کریں گے''۔ اس لیے نائب کی حیثیت سے ہم دنیا میں اس طرح زندگی گزاریں جیسی اللہ چاہتا ہے، جو اصل انتظام والی ہستی چاہتی ہے، نائب اسی کی مرضی کے مطابق عمل کرتا ہے۔

اللہ انسانوں کی بھلائی چاہتا ہے ان کی فلاح اور ترقی چاہتا ہے؛ لیکن اس کے بتائے ہوئے طریقے اختیار کرنے کے بعد مسلمانوں نے جب اس بات کو سمجھا اور اختیار کیا تو علم سے فائدہ اٹھایا، اور بام عروج پر پہنچ گئے، اللہ چاہے گا تو مسلمان پھر ابھرے گا۔

اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک اس کو خود اپنی حالت بدلنے کی فکر نہ ہو، لوگوں میں شعور بیدار ہو رہا ہے، وہ کوشاں ہیں ملت کے لیے۔ دین کے لیے، دینداری امت کو اب تک زندہ رکھے ہوئے ہے۔ پروردگار ہم سے ناراض نہ ہو، اس کو راضی کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

☆☆☆☆☆

فکرِ معاصر

عالمِ انسانیت پر احسانات وانعامات

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

اسلام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف صلیبی یہودی عداوت دشمن کے رگ و پے میں خون کی مانند گردش کرتی رہتی ہے اور زمان و مکان کے اختلاف کے ساتھ ساتھ اس کی شکلیں بھی بدلتی رہتی ہیں، کبھی زبان وقلم کی قینچی سے اسلام کی تصویر بگاڑی جاتی ہے اور کبھی فکری و تہذیبی حملے کیے جاتے ہیں، کبھی اسلامی شریعت اور اسلامی تہذیب وتمدن اور اسلامی تاریخ کے سلسلہ میں سوقیانہ خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اسلامی شعائر اور اس کے مقامات مقدسہ کی توہین کی جاتی ہے اور سابقین اولین صحابہ کرامؓ کے سلسلے میں کوشش کی جاتی ہے کہ ان کے مقام بلند سے کھلواڑ کیا جائے اور خلفائے راشدین کی شان عالی میں گستاخی کی جائے۔ اسلام کے خلاف ان کی یہ معاندانہ روش یہیں پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات کے سلسلہ میں الزام تراشیاں کی جاتی ہیں، تاریخ اسلام ان جیسے نازک وحساس مراحل سے بارہا گزر چکی ہے اور ان خرافات سے بار بار اس کا سابقہ پڑ چکا ہے۔

جب کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ عالم انسانیت میں بلند اخلاقیات کا وجود اسلام کا مرہون منت ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ سب خاتم الانبیاء، امام الاتقیاء محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت ہے، اس بات کی شہادت قرآن کریم نے بھی اسلوب بدل بدل کر دی ہے، کتنی آیتیں ہیں جن میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ رحمت عالم محمد عربی کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، اور کسی بھی مومن کا ایمان اس کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ خدا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دونوں پر بیک وقت ایمان نہ لائے اور شکر ووفاداری کا نذرانہ اس وقت تک ادا نہیں ہوسکتا جب تک اس بات کا اقرار نہ کرے کہ ساری دنیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی مرہون منت ہے جنہوں نے علم وعرفان کا دریا بہایا اور زندگی کو ایک پاکیزہ عقیدہ سے مزین کیا اور لوگوں کو آداب زندگی سکھائے اور جہالت وعداوت، بغض وحسد کی تنگ گھاٹی سے نکال کر اخوت ومحبت کی جولان گاہ میں لا کھڑا کیا اور ایسے صالح معاشرہ کی تشکیل کی جس نے انسانوں کا مقام بلند کیا اور ایک پر امن اور شریفانہ زندگی گزارنے پر آمادہ کیا، اور ان کے اندر جدوجہد، حرکت ونشاط اور فعالیت کی روح پیدا کی اور اس طرح اسلامی تہذیب کی بنیاد پڑی، اس نے عالم انسانیت میں عفت وپاکیزگی کا مزاج ایسے وقت میں پیدا کیا، جس وقت انسان اپنا مقام کھو چکا تھا اور لوگوں کی زندگیاں امتیاز رنگ ونسل، قومیت ووطنیت کے مختلف خانوں میں بٹ گئی تھیں اور انسانی خواہشات کا غلام بن کر رہ گئی تھیں، جہاں طاقتور کمزور پر حکومت کرتا اور امیر فقیر پر، اور پوری انسانیت کے ساتھ ذلیل غلاموں جیسا سلوک کیا جاتا بلکہ جانوروں سے بھی بدتر۔

لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نے ان تمام آمرانہ وانتہا پسندانہ روایات کا خاتمہ کیا اور پوری انسانیت کو ایک صف میں لا کھڑا کیا، اور ہر انسان کو جینے کی آزادی عطا کی، حدود میں رہ کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت دی، اس کو آپسی خیر خواہی، بھائی چارہ، محبت والفت کی تلقین کی، فضیلت وعزت اور اشرفیت کے سارے جھوٹے پیمانوں کو منسوخ کیا اور سب کے لیے ایک پیمانہ اور ایک معیار مقرر کیا اور وہ تقویٰ الٰہی ہے۔

علامہ ابن قیم جوزیؒ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوشان، خدا سے آپ کے گہرے قرب وتعلق اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت، فرشتوں کے درمیان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر دل عزیزی کی شہادت دی ہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بوجھ ہلکا کیا، اور آپؐ کے مخالفین کی قسمت میں ہمیشہ کے لیے ذلت وخواری لکھ دی، لہٰذا اپنی کتاب " زاد المعاد" میں تحریر فرماتے ہیں:

''میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور وحی سماوی کے پاسبان وامین اور اللہ کے منتخب شدہ اور خدا اور بندے کے درمیان واسطۂ دینِ مستقیم کے فرستادہ اور راہ حق کے راہبر ہیں، ان کو اللہ نے رحمت عالم امام الانبیاء اور ساری مخلوقات ارضی کے لیے امن ومحبت کا پیامبر بنا کر مبعوث فرمایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے زیادہ واضح راستے کی طرف رہنمائی کی اور تمام

بندگان خدا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو لازم قرار دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعظمت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کو خدائی شان قرار دیا گیا، دخول جنت کے لیے دامن مصطفوی سے وابستگی مشروط کی گئی، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ کو کھول دیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہرت کو دوام عطا ہوا، آپؐ کے بوجھ کو ہلکا کیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرنے والے کی قسمت میں ذلت ومسکنت لکھ دی گئی۔

چنانچہ مسند ابو منیب جرشی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بعثت بالسيف بين يدي الساعة حتى يعبد الله وحده لا شريك له، وجعل رزقي تحت ظل رحمي وجعل الذلة والصغار على من خالف أمري ومن تشبه بقوم فهو منهم“ (پس جس طرح ذلت و نکبت عاصی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تقدیر میں لکھ دی گئی ہے اسی طرح عزت وسربلندی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں کی قسمت کے ساتھ وابستہ کردی گئی ہے)۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ“ [منافقون:۸] عزت تو صرف اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور ایمانداروں کے لیے ہے: ”فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْا إِلَى السَّلْمِ، وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ، وَاللّٰهُ مَعَكُمْ“ [محمد:۳۵] (پس تم بودے بن کر صلح کی درخواست پر نہ اتر آؤ، جبکہ تم ہی بلند وغالب رہو گے، اور اللہ تمہارے ساتھ ہے) ”یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ“ [انفال:۶۴] (اے نبی! تجھے اللہ کافی ہے اور ان مؤمنوں کو جو تیری پیروی کرتے ہیں)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عالم انسانیت پر جو احسانات وانعامات اور نوازشیں کی ہیں، وہ حد شمار سے فزوں تر ہیں، اور یہ عالم جدید اپنی ثقافت، اپنے کلچر اور اپنی صنعت، اپنی ایجادات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا مرہون منت ہے، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود نہ ہوتا تو نہ آداب ہوتے، نہ اخلاق اور نہ علوم وفنون کی کثرت، اگر آپ کی ہستی نہ ہوتی تو انسانیت اپنے پیام ومرتبہ سے ناآشنا رہتی، نہ وہ فریضۂ خلافت کی اہل قرار پاتی، بلکہ شقاوت وبدبختی اور نخوت وانانیت کے گڑھے میں پڑی ہوتی۔

ان ملحدوں اور غفلت شعاروں کو یاد رکھنا چاہیے جن کے دل اپنی کرتوتوں کی وجہ سے اس طرح سے زنگ آلود ہوگئے کہ فضائل و رذائل، شقاوت و سعادت کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت بھی جاتی رہی اور وہ گمراہی وضلالت میں پڑے ہوئے بدنصیبی اور شقاوت کی زندگی گزار رہے ہیں۔

لہٰذا نہ انہیں رذائل کی پرواہ ہے نہ گندے حالات کی، اللہ تعالیٰ نے ان کے جھوٹ اور افترا پردازیوں کی جو صاف صاف گواہی دی ہے انہیں اس کو ہرگز نہ بھولنا چاہیے، وہ کان کھول کر سن لیں۔

”كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ، إِنْ يَّقُوْلُوْنَ إِلَّا كَذِباً“ [کہف:۵] (بہت بڑی بات ہے جو ان کے زبان سے نکل رہی ہے، وہ سوائے جھوٹ کے اور کچھ نہیں کہتے)۔

☆☆☆☆☆

بقیہ صفحہ ۱۳/ کا ....

بیدردی اور خشونت سے نہیں، عبدیت اور عبودیت کے جذبہ سے مغلوب ہوکر، اپنے اور اس کے دونوں کے خالق ومالک کو یاد کرکے، یہ کہتے ہوئے اسے زمین پر قبلہ رولٹائے گا کہ اے ہمارے مالک ومولا! قبول کر ہماری قربانی، جس طرح تو نے قبول کی قربانی اپنے خلیل ابراہیمؑ کی۔

مبارک وہ انسان جو دور کا بہت دور کا بھی، تشبہ پیدا کرسکے، ابراہیم خلیلؑ سے۔

مبارک تر ہے وہ قربانی کا جانور جو برائے نام سہی، کوئی نسبت تو قائم کرسکے اللہ کے ذبیح اسمٰعیلؑ سے۔

گلے پر چھری پھیرتا جائے گا اور کہتا جائے گا:

”اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ“ میری ساری توجہ کا مرکز، میری ساری عبودیت کا قبلہ، تو اے قبلہ حاجات صرف آپ ہیں، زمین وآسمان کے پیدا کرنے والے مجھے اور کسی سے غرض کیا؟ میں اپنا رشتہ تو سب سے توڑے ہوئے ہوں، صرف آپ سے جوڑے ہوئے ہوں، اس وقت بھی نیت صرف آپ سے تقرب کی ہے، تعمیل آپ ہی کے حکم کی ہے، عید قرباں یادگار ہے، دنیا کے اول المسلمین کی، ایک قدیم ترین موحد کے ایثار کی، حق ہے کہ توحید کا رنگ جھلکے، اس کی ایک ایک شان سے، اس کی ہر ہر آن سے، اسلام کی جنتری میں جشن صرف دو ہیں، عید اور بقرعید، اور دونوں کا مقصد ہے امت کی مرکزیت اور شیرازہ بندی، ایک یادگار ہے نزول قرآن کی، دوسری یاد دلاتی ہے کعبہ کی تعمیر کو، کعبہ کے معمار کو۔

☆☆☆☆☆

فہم وفراست

دینی مزاج - اسلامی معاشرے کی اولین ضرورت

مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی

اہل ایمان سے مطالبہ ہے کہ دین ان کے مزاج میں داخل ہو اور وہ اس کی تعلیمات کو اپنے اندر جذب کرلیں، اگر ان کے اندر دین کا مزاج پیدا نہ ہوا اور صرف ظاہری چیزوں کا اہتمام رہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ جس طرح زمین کو پانی سے سیراب کیا جاتا ہے تو جو زمین اپنے اندر پانی جذب کرلیتی ہے، زمین برگ وبار لاتی ہے اور لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے، لیکن جو زمین اپنے اندر پانی جذب نہیں کرتی بلکہ اس کا پانی اوپر گڑھے ہی میں بھرا رہتا ہے تو کبھی وہ کیچڑ بن جاتا ہے اور لوگوں کے لیے نقصان کا باعث بنتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جب تک حقیقی علم ہمارے اندر جذب نہ ہو اور عبادت کا صحیح ذوق اور حقیقی معنی میں اس کا ذائقہ نصیب نہ ہو اور سب سے بڑھ کر مکمل دین کا مزاج ہمارے اندر پیدا نہ ہو تب تک ظاہری چیزوں کے ذریعہ نہ ہمیں ذاتی طور پر کوئی خاص نفع حاصل ہوگا اور نہ ہی ہماری زندگیوں کا دوسروں پر کوئی اثر پڑے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ دین کا مزاج بننا ایک بالکل الگ چیز ہے جو مشکل سے بنتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہر کام کرنا آسان ہے، اس لیے کہ بعض مرتبہ آدمی جوش میں آکر بڑے بڑے کام کر جاتا ہے۔ لیکن دین کا مزاج بنانا کوئی وقتی کام نہیں ہے اور نہ ہی اس کا تعلق جذباتیت سے ہے، حقیقت میں یہ ایک طویل سفر ہے اور اس کے لیے صحیح اسلامی شعور، صبر وحلم اور دین کی باریکیوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس کو اصلاً ''فہم دین'' کہا جاتا ہے۔

اسلام میں ''فہم دین'' کی غیر معمولی اہمیت ہے، اگر دین کا فہم نہ ہو تو آدمی کبھی متوازن نہیں رہ سکتا اور نہ ہی دین کا صحیح ترجمان بن سکتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ظاہر میں دیکھنے والے لوگ اس کو بڑا بزرگ وعالم سمجھ رہے ہوں اور وہ بظاہر بڑے حقائق ومعارف بھی بیان کر رہا ہو، لیکن اگر اندر سے دین کا مزاج نہیں بنا ہے تو کبھی کبھی ایسے حالات بھی آتے ہیں اور ایسی صورت پیدا ہوتی ہے کہ ایک منٹ میں سب ہوا ہو جاتا ہے۔

مشہور قصہ ہے کہ ایک بادشاہ کے دربار میں کسی نے یہ بات کہی کہ اگر جانور کو سدھا دیا جائے تو وہ انسانوں کی طرح کام کرسکتا ہے، دربار میں موجود صاحب عقل لوگوں نے کہا کہ ایسا نہیں ہوسکتا، جانور جانور ہے اور اس کی فطرت وطبیعت تبدیل نہیں ہوتی۔ جب بحث زیادہ بڑھی تو بادشاہ نے حکم دیا کہ جو لوگ جانور کو سدھا کر اس کی طبیعت کے تبدیل ہو جانے کی بات کہتے ہیں وہ اس کا کوئی نمونہ پیش کریں۔ جن لوگوں نے اس کا دعویٰ کیا تھا انہوں نے کچھ بلیوں کو لے کر خوب سدھایا، یہاں تک کہ جب ان کے امتحان کا وقت آیا تو ان لوگوں نے بلیوں کو دربار کے اندر بٹھا دیا اور ان کے ہاتھوں میں چراغ دے دیا، یہ دیکھ کر سب ہی لوگ حیران تھے کہ کیا واقعی بلیاں بھی انسانوں کی طرح اس سلیقہ کے ساتھ چراغ لے کر بیٹھ سکتی ہیں؟! اس کے بعد وہ لوگ دربار میں حاضر ہوئے جن کا دعویٰ تھا کہ جانور کی فطرت وطبیعت تبدیل نہیں ہوتی اور انہوں نے اس بات کو ثابت کرنے کے لیے بھرے دربار میں دو تین چوہے بلیوں کے سامنے چھوڑ دیے، نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے ہی بلیوں کی نگاہ چوہوں پر پڑی تو وہ اپنی سب تربیت بھول گئیں اور چوہوں کے اوپر دوڑ پڑیں اور ان کی حقیقت لوگوں کے سامنے کھل گئی یعنی تربیت کے اوپر مزاج غالب آ گیا۔

دین کے مطابق مزاج کو ڈھالنا بہت ضروری ہے، لیکن مزاج کا بدلنا آسان نہیں ہوتا، ایک چیز آدمی کی طبیعت اور اس کے مزاج میں داخل ہو جائے، اس میں بڑا وقت لگتا ہے، اس کے لیے ضرورت ہے مسلسل محنت کرنے کی، جس طرح تھوڑا تھوڑا پانی زمین پر ڈالنے سے زمین پانی کو جذب کرتی ہے اور اگر تیزی کے ساتھ زمین پر پانی ڈالا جائے تو وہ بہہ جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح دین کا مزاج بنانے اور اپنے مزاج میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے بھی مسلسل کوشش کی ضرورت ہے تاکہ دین ہمارے اندر جذب ہو جائے اور وہ ہمارے مزاج کا حصہ بن جائے، یہاں تک کہ آدمی سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مزاج میں داخل کرلے اور اس کو اپنے اندر اس طرح جذب کرلے کہ وہ اس کا عکس بن جائے، لیکن اس کے لیے مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان صفاتِ حمیدہ سے خود کو متصف کرنے کی کوشش کریں جن کے ذریعہ سے جذب کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے اور دین کا مزاج بنتا ہے مثلاً: اخلاص، تقویٰ، سنجیدگی، متانت، صبر وحلم اور عفو ودرگذر وغیرہ۔ واقعہ یہ ہے کہ جن لوگوں میں جذباتیت ہوتی ہے ان کا دینی مزاج مشکل سے بنتا ہے لیکن جن کے اندر حلم وبردباری جیسی خصائل حمیدہ ہوتی ہیں، ان

میں قبول کرنے اور دین کو جذب کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے، اس لیے کہ وہ ہر بات کہنے سے پہلے بجائے خود اس پر غور وفکر کرتے ہیں اور سب سے پہلے اپنے آپ اس پر عمل کرتے ہیں اور اسی کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے لیے دین کا مزاج بنانا نسبۃً آسان ہوتا ہے۔

دین کی باتوں کا اوپر اوپر رہنا کافی نہیں ہے، اوپر کی چیز زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتی مثلاً: کسی چیز پر سونے کی پالش کردی جائے تو وہ چیز بجائے خود سونے کی نہیں بن جائے گی بلکہ جب اس کی پالش اترے گی تو اس کی حقیقت سامنے آجائے گی، اسی طرح ہمیں اپنے اندر دین کو جذب نہ کرنا اور اس کے مطابق اپنا مزاج نہ بنانا بلکہ اوپر اوپر سے بڑے بڑے حقائق ومعارف بیان کرتے رہنا اور ظاہری چیزوں میں الجھے رہنا' درست نہیں ہے۔ آدمی کے مزاج کے اندر دین کا اترنا اصل ہے اور اگر یہ مزاج نہیں بنتا تو جب اندر کی چیز سامنے آتی ہے تو آدمی کی سب حقیقت کھل جاتی ہے مثلاً: بعض مرتبہ آدمی کے اندر سے خاندان یا ذات وبرادری کی بنیاد پر عصبیت کے جذبات جب ظاہر ہوتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ حقیقی معنی میں دین کے مطابق مزاج نہیں بنا ہے۔

انسان کا تنہا علم وعبادت اس وقت تک اس کے کام نہیں آتا جب تک صحیح طریقہ پر اس کی حقیقت دل میں جذب نہ ہوجائے اور اللہ سے قلبی تعلق کی لذت حاصل نہ ہوجائے۔ اگر اس نعمت کو حاصل کرنے کے لیے آدمی نے صفاتِ حمیدہ کو اختیار کرکے آہستہ آہستہ دینی مزاج بنانے کی کوشش کی اور وہ اپنا جائزہ بھی لیتا رہا تو ان شاء اللہ اسے ضرور کامیابی حاصل ہوگی۔

دینی مزاج پیدا کرنے کے سلسلہ میں چند باتیں انتہائی اہم اور مفید ہیں مثلاً: آدمی اپنے بارے میں مسلسل غور وفکر کرتا رہے۔ یا وہ کسی کو اپنا بڑا بنالے اور اس سے ہر معاملہ میں مشورہ لیتا رہے اور اس کے ذریعہ اپنی خامیوں اور خوبیوں کو معلوم کرتا رہے۔ یا یہ کہ کسی دینی مجلس میں شریک ہو اور وہاں جو باتیں کی جائیں ان کو توجہ سے سنے اور ان باتوں کی روشنی میں اپنی خامیوں کا علاج تلاش کرے، بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ براہِ راست آدمی کی خامی پر توجہ کرانے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ اصلاح کی ایک عمومی بات کہی جاتی ہے اور سمجھنے والا اسی کی روشنی میں اپنی غلطی کی اصلاح کرلیتا ہے، البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سلسلہ میں بعض مرتبہ بہت سے لوگوں کو دھوکہ ہوجاتا ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھی طرح بات سمجھ گئے حالانکہ وہ بالکل نہیں سمجھے ہوتے ہیں، ایسی صورت میں باقاعدہ توجہ دلانے کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ عام طور پر تقریباً اسّی فیصد سے زائد لوگوں کا حال یہ ہے کہ انہیں باقاعدہ توجہ دلانے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ ایک عمومی نصیحت ہی سے وہ اپنی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔

دینی مزاج پیدا کرنے کے سلسلہ میں بزرگوں کے یہاں قیام بھی بڑی مفید چیز ہے؛ لیکن اس میں دن دو دن کے قیام سے زیادہ نفع حاصل نہیں ہوتا، بلکہ میرا اندازہ یہ ہے کہ کم از کم آدمی کو دس دن کے قیام کی ترتیب ضرور بنانی چاہیے، اس لیے کہ ضروری نہیں کہ آپ ایک یا دو دن کے قیام کی نیت سے حاضر ہوں اور اسی وقت آپ کے سامنے ایسی بات آجائے جو آپ کی اصلاح کے لیے کافی ہو، بلکہ یہ باتیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آتی ہیں، وہ اپنے بندوں سے جو چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے' کہلواتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دین کا بھی یہی اصول ہے، اس لیے کہ قرآن مجید بھی ایک دم نازل نہیں ہوا بلکہ تھوڑا تھوڑا نازل ہوا اور ۲۳/سال تک مسلسل نازل ہوتا رہا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین کو سیکھنے کا نظام بھی اسی طرح ہے، اب اگر کوئی آدمی یہ سوچے کہ ہم دو دن میں اپنے اندر دین کا مزاج پیدا کرلیں اور پورا دین سیکھ لیں' تو ایسا کبھی نہیں ہوتا اور یہ ایک بہت مشکل کام ہے، اس لیے کہ دین کا مزاج بنانے کے لیے وقت لگتا ہے اور وقت لگنے کا سبب یہ ہے کہ دین کی ضروری اور بنیادی باتیں کسی بھی جگہ ایک وقت میں ہونا ممکن نہیں ہیں بلکہ موقع ومحل کی مناسبت سے باتیں کہی جاتی ہیں اور انہی باتوں میں بعض مرتبہ اللہ تبارک وتعالیٰ کوئی ایسی بات کہلوا دیتا ہے جو کسی کو نفع پہنچا دیتی ہے، لیکن اگر وہی بات بغیر کسی موقع ومناسبت کے کسی سے ایک دم کہہ دی جائے تو اس کا وہ اثر نہیں ہوتا، البتہ اگر وہی بات بین السطور آجائے تو اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے اور وہ اس طرح آدمی کے اندر جذب ہوجاتی ہے کہ آدمی کا کام بن جاتا ہے۔ اس لیے اگر آدمی بزرگوں کی صحبت میں پوری بیدار مغزی کے ساتھ وقت گذارے اور ہر وقت یہ سوچے کہ جو بات یہاں کہی گئی ہے' کیا وہ ہم پر منطبق ہوتی ہے کہ نہیں؟! تو اس کا غیر معمولی فائدہ ہوتا ہے اور دین کا مزاج بننا آسان ہوجاتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ دین کی بات کہنے والا بھی خود اپنے متعلق سوچے اور اپنا محاسبہ کرے، کہنے والا خود کو فارغ اور نقائص سے پاک نہ سمجھے، سچی بات یہ ہے کہ کہنے والا تو سب سے زیادہ ضرورت مند ہے۔ دینی مجالس اور مذاکرات کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ کہنے والا بھی سوچتا ہے اور سننے والا بھی

سوچتا ہے کہ ہمارے اندر کیا عیوب ونقائص ہیں جن کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔

دین اسلام کی خوبی یہ ہے کہ یہ مختلف قسم کے پھولوں کا ایک حسین گلدستہ ہے، اس میں عقائد بھی ہیں عبادات بھی، معاملات بھی ہیں معاشرت بھی، نظام زندگی بھی ہے اور دوسروں کے ساتھ روابط وتعلقات کی تعلیم بھی، اس کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ گویا یہ ساری چیزیں ایک گلدستے کی شکل میں سجا کر ہمیں دی گئی ہیں اور گلدستے کی خوبصورتی کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں مختلف قسم کے پھول ہوں، اگر کسی گلدستے میں ایک ہی رنگ کے پھول بھر دیے جائیں تو اس کا وہ حسن باقی نہیں رہتا۔ ٹھیک اسی طرح دین اسلام کے حسین گلدستہ کا ہم سے یہ مطالبہ ہے کہ ہم کسی ایک رخ پر نہ بہہ جائیں، بلکہ اس کا حسن تو تب نظر آئے گا جب ہم دین کے پورے نظام کو سمجھیں اور اس کو اپنی ذاتی زندگی میں عملاً ڈھالنے کی فکر کریں۔ اگر ہم نے اس کی کوشش کرلی تو اس کے ذریعہ بڑی تبدیلی آسکتی ہے۔

موجودہ دور میں مسلمانوں کی زندگیوں میں بڑی ناہمواریاں نظر آتی ہیں، ایک طرف تو عبادات کے لحاظ سے گرچہ ان کا معیار بلند ہے لیکن دوسری طرف ان کے اندر ایسی خرابیاں اور برائیاں پائی جاتی ہیں جن کی برائی کا احساس بھی شاید ان سے رخصت ہو چکا ہے، مسلم سماج میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں جن سے اس بات کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے مثلاً: ایک آدمی ہے جو روزہ ونماز کا پابند ہے مگر وہ رشوت بھی لے رہا ہے، ایک طرف وہ ذکر وتلاوت کررہا ہے مگر اسی کے ساتھ وہ دوسروں کو دھوکہ بھی دے رہا ہے اور لوگوں کا مال بھی ہڑپ کررہا ہے۔ ظاہر بات ہے ایسی صورت میں دین کی ظاہری صورتوں کا ذاتی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا اور نہ ہی اسلام کے حسین گلدستہ کی خوبصورتی باقی رہ سکتی ہے، اس لیے کہ اس گلدستہ کے اندر ایسی گندی چیز داخل کردی گئی جس نے اس کا پورا حسن بگاڑ دیا۔

حاصل یہ کہ دین کا مزاج بننا انتہائی ضروری اور اہم کام ہے مگر یہ کام سب سے زیادہ مشکل ہے۔ اس سلسلہ میں خاص طور سے سب سے بڑھ کر ہمارے علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایک رَو میں نہ بہیں بلکہ حقائق کو دیکھیں اور غور وفکر سے کام لیں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی ہم سب کے لیے نمونہ ہے، خواہ وہ مکی زندگی ہو یا مدنی، بعض لوگوں کو اس سلسلہ میں بھی بڑا دھوکہ ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی منسوخ ہوگئی ہے، ظاہر ہے یہ بات بالکل غلط ہے، ارشاد الٰہی ہے:

"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" [الأحزاب:۲۱] (یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں بہترین نمونہ موجود ہے)۔

اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور کی زندگی کو اسوۂ حسنہ نہ مانا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم رسول نہیں تھے؟ واقعہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیرہ سالہ رسالت کی زندگی مکہ میں گذری ہے اور دس سال کی زندگی مدینہ میں، جس طرح مدینہ کی زندگی نمونہ ہے اسی طرح مکہ کی زندگی بھی نمونہ ہے۔ ہمیں اپنے گرد وپیش کے حالات دیکھنا چاہیے اور جہاں جیسے حالات ہوں اسی کے مطابق عمل کرنا چاہیے، حالات کو سمجھ کر سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے روشنی حاصل کرنا ہی اصل فہم ہے اور جس کو یہ فہم حاصل ہوجائے گویا اس کو بہت بڑی دولت مل گئی، اس لیے ہمیں اس پر خاص طور سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

دین میں بہت سی چیزیں فکری ہیں اور بہت سی چیزیں عملی ہیں، فکری چیزوں کی مثال یہی بات ہے جو اوپر گذری کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں زندگیوں کو اپنے لیے اسوۂ حسنہ سمجھنا ضروری ہے، ان دونوں کو اچھی طرح سمجھ کر ہی آدمی کے اندر صحیح فکری توازن قائم ہوگا اور اس کو علم ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کون سا نمونہ کب اور کہاں اختیار کرنا ہے؟ لیکن اگر فہم اور علم نہیں ہوگا تو پھر ایک آدمی بہت زور اور اصرار سے کہے گا کہ ہمیں سامنے والے سے بھڑ جانا چاہیے اور ایک آدمی بہت زور اور اصرار سے کہے گا کہ ہمیں سامنے والے سے کچھ نہیں کہنا چاہیے بلکہ سب معاف کردینا چاہیے۔ ظاہر ہے اسلام میں دونوں باتیں ہیں، کبھی بھڑنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے لیکن اکثر ہمیں معاف کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس لیے اس سلسلہ میں صحیح اور متوازن نقطہ نظر کیا ہوگا؟ اس کو حالات کے اعتبار سے سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے، کہیں بھڑنا وقت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اکثر جھکنا وقت کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمیں اسی چیز کو سمجھنا ہے۔ اگر ہم خود نہیں سمجھ سکتے تو ہمیں جاننے والوں سے پوچھنا چاہیے۔ یہ دین کی اصل مزاج شناسی ہے۔

اسی طرح دین کی بہت سی باتیں عملی ہیں، ان کے اندر بھی ہمیں صحیح توازن قائم کرنے کی ضرورت ہے مثلاً: کسی آدمی کے اندر تلاوت کا ذوق پیدا ہوا تو اب ماشاء اللہ تلاوت ہی تلاوت ہورہی ہے، یا نوافل پڑھنے کا شوق ہوا تو اب ماشاء اللہ خوب نمازیں ادا کی جارہی ہیں، لیکن جب ہم اس سے فارغ ہوئے اور باہر نکل کر کسی سے ملاقات ہوئی تو

فوراً کسی کو گالی دے دی، یا کسی کو سخت بات کہہ دی، یا کسی کی غیبت کردی، ظاہر ہے یہ صحیح توازن نہیں ہے اور اس کے نتیجہ میں ہماری زندگیوں کے اندر بے شمار عملی ناہمواریاں پائی جاتی ہیں۔ ہم غور کریں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں اسلام کا جو حسین گلدستہ دیا تھا، جس کے اندر زندگی کے ہر شعبہ کی تعلیم تھی اور وہ مختلف قسم کے پھولوں سے سجا ہوا تھا' ہم نے اس حسین گلدستے کو کیسا بدنما کردیا۔ ضرورت ہے کہ ہم دین کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوں، اس کو اپنے اندر جذب کرلیں اور اس کی باریکیوں کو سمجھیں تاکہ ہماری زندگی فکری' علمی اور عملی اعتبار سے دین کے مطابق ہو اور اس کے نتیجہ میں ہمارے اندر اعتدال پیدا ہو۔

اس زمانہ میں دینی مزاج کے مطابق اپنے ذہن کو نہ ڈھالنے کا مرض عام ہے اور لوگ جذباتی باتوں کو پسند کرتے ہیں۔ ہمیں جذباتیت کے بجائے پوری سنجیدگی ومتانت اور صحیح شعور کے ساتھ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اختیار کرنا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن حالات میں جو عمل کیا اور جو طریقہ اختیار فرمایا، ہمیں بھی حالات کے مطابق وہی طریقہ اختیار کرنا ہے۔ اگر آدمی اس مزاج کے ساتھ زندگی گذارنے کی کوشش کرے تو پھر وہ دین کا نمائندہ بنے گا اور اگر اس کے مطابق اس نے زندگی گذارنے کی کوشش نہ کی تو وہ جو چاہے کرے اور لاکھ دعویٰ کرے کہ ہم بڑے عابد وپرہیزگار ہیں، ہم بہت صاحب علم ہیں اور ہم سب کچھ جانتے ہیں؛ لیکن حقیقت میں وہ کچھ نہیں جانتا، اس لیے کہ اس کو جو فائدہ اٹھانا چاہیے وہ اس نے نہیں اٹھایا، وہ دین کا صحیح فہم حاصل نہیں کرسکا اور اسی لیے وہ کہیں نہ کہیں ٹھوکر کھا رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

دولتِ عثمانیہ اور ترکی کی تاریخ — تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ

مولانا عتیق احمد بستوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

جلد اول (صفحات ۴۸۸) قیمت -/450

جلد دوم (صفحات: ۷۰۴) قیمت -/550

جلد سوم (صفحات: ۵۶۰) قیمت -/500

کل میزان -/Rs.1500

رعایت کے بعد مع ڈاک مصارف -/1000 روپئے میں دستیاب ہے۔

نئی مطبوعات دیدہ زیب طباعت دولت عثمانیہ اور ترکی کی تاریخ کی مفصل داستان آسان اور دلنشیں پرایۂ بیان میں لکھی گئی۔

دولتِ عثمانیہ کا عروج وزوال، سلطان عبدالحمید ثانی کے دورِ خلافت اور ان کے کارناموں کی تفصیل، خلافتِ اسلامیہ کو ختم کرنے کا سانحہ، انجمن اتحاد وترقی اور مصطفیٰ کمال پاشا کے دورِ حکومت کے اہم واقعات، ترکی میں اسلامی بیداری کے حوصلہ افزا اقدامات وحالات، سلطان عبدالحمید ثانی کی دو ڈائریاں، نیز موجودہ صدر ترکی رجب طیب اردوگان کے مؤمنانہ اقدامات۔

مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام، لکھنؤ

ٹیگور مارگ، ندوہ کیمپس، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

فون نمبر: 0522-2741539

موبائل نمبر 8318841286 / 9889378176

بارکوڈیا اکاؤنٹ نمبر کے ذریعہ رقم جمع کرا کر تینوں جلدیں حاصل کرسکتے ہیں۔

Account N0 10863759700

ACADEMY OF ISLAMIC RESEARCH & PUBLICATION

STATE BANK OF INDIA MAIN BRANCH LUCKNOW

IFSC CODE SBIN0000125

شکرواحسان

تم کس بات پہ اتراتے ہو؟

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

اپنے آپ کو دوسرے سے افضل سمجھنا بالکل بے بنیاد ہے، کیا معلوم کہ آخر میں جاکر کیا انجام ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے یہاں کون مقرب ہے اور کون مقرب نہیں ہے، نہ وہاں علم کی بڑائی کام آئے گی، نہ عمر کی بڑائی کام آئیگی، نہ وہاں مال و دولت کی کثرت کام آئے گی، نہ اس کی گارنٹی ہے کہ جس کے پاس علم زیادہ ہے وہ ضرور افضل ہوگا، جبکہ حدیث شریف میں ہے کہ سب سے پہلے جہنم جس کے ذریعہ سلگائی جائے گی وہ ایک عالم ہوگا لہٰذا صرف علم کے بھروسے پر یا اس بنا پر کہ لوگ دنیا میں میرے ہاتھ چومتے ہیں، یا مجھے بڑا سمجھتے ہیں، یا علامہ سمجھتے ہیں، میں افضل ہوں، یاد رکھئے! اس پر کوئی بھروسہ نہیں ہے، جب حساب کتاب کا منظر سامنے ہوگا تو بڑے بڑے علامہ دھرے رہ جائیں گے، لہٰذا علم کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسرے سے کیا افضل سمجھے، اسی طرح مال کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسرے سے کیا افضل سمجھے، جبکہ قیامت کے دن بڑے بڑے مالدار جہنم کا ایندھن بنیں گے، لہٰذا جب کسی بات کا بھروسہ نہیں تو پھر کس بنیاد پر آدمی اپنے آپ کو دوسرے سے افضل سمجھے۔

ایک بزرگ کا واقعہ

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ ایک آدمی نے ان سے یہ کہہ دیا کہ تم تو میرے کتے سے بدتر ہو، ان بزرگ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ بات در اصل یہ ہے کہ ابھی میرا کچھ پتہ نہیں کہ میں کتے سے بدتر ہوں یا نہیں، جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی اور وہاں پر میں حساب کتاب کے مرحلے کو پار کر گیا تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں کتے سے افضل ہوں، اور اگر میں وہاں حساب کتاب کے مرحلے سے نہ گزر پایا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق ہوگیا پھر بیشک تم ٹھیک کہتے ہو کہ میں کتے سے بدتر ہوں، اس لیے کہ کم از کم اس کتے کو حساب کتاب نہیں دینا پڑے گا اور اس کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا سامنا نہیں ہوگا۔

یہ خیال دل سے نکال دو

یہ ہیں حقیقی معنی میں اللہ والے، دوسرا شخص گالی دے رہا ہے، لیکن یہ اپنے حقائق اور معارف میں گم ہیں، اور اپنی حقیقت حال کو دیکھ رہے ہیں کہ میری حقیقت تو یہ ہے، لہٰذا دماغ سے افضل ہونے کا خیال نکال دو، نفس سے کہے کہ تمہیں کیا معلوم کہ خدا تعالیٰ کے یہاں کون اچھا ہے، ممکن ہے کہ اس کا باطن اچھا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں خدا تعالیٰ کے نزدیک بڑا ذلیل وخوار ہوں، اور خدا تعالیٰ نے تجھ کو دو چار حرف ظاہری سکھا دیے ہیں، اس لیے تو بڑائی کرتا ہے، اگر وہ چاہے تو آج چھین لے، کس چیز پر تو اکڑتا ہے اور اتراتا ہے؟ کیا یہ علم تجھے ماں کے پیٹ سے حاصل ہوگیا تھا؟ کسی نے اپنے فضل وکرم سے عطا فرمادیا، اور جس نے عطا فرمایا ہے وہ جب چاہے سلب کر لے، جب چاہے واپس لے لے، کیا تو مال پر اکڑتا ہے، کیا یہ مال تجھے ماں کے پیٹ سے ملا تھا؟ کسی دینے والے نے مال دیا ہے، اور جس نے دیا ہے وہ جب چاہے واپس لے لے، کیا تو صحت پر اکڑتا ہے؟ بڑے بڑے تندرست اور توانا لوگ ایسے گزر رہے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان سے صحت واپس لی تو وہ بتاشے کی طرح پچک گئے۔

سبق آموز واقعہ

ہمارے ایک عزیز تھے، جن کا ابھی ایک دو سال پہلے انتقال ہوا، ان کے بارے میں سارے دیوبند میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ برف کی سلی کو مکا مار کر توڑ دیتے تھے، اتنے طاقت ور تھے، انہوں نے کبھی زندگی میں تربوز کو چاقو سے نہیں کاٹا، بس مکا مارا اور توڑ دیا، اور اس کے ساتھ ساتھ بڑے عابد وزاہد آدمی تھے، بعد میں لاہور میں مقیم ہوگئے تھے، چار پانچ سال پہلے لاہور میں ان سے ملاقات کے لیے گیا تو دیکھا کہ کھانا کھانے کے لیے ہاتھ منہ تک نہیں اٹھ رہا تھا، دوسرے لوگ کھانا کھلا رہے تھے، جب میں ان کے پاس پہنچا تو مجھے دیکھ کر رو پڑے، اور کہنے لگے کہ یہ وہی ”حامد“ ہے، جو برف کی سلی مکے سے توڑ دیا کرتا تھا، اور اب یہ حال ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھا سکتا۔

تم کس بات پہ اتراتے ہو؟

ارے تم کس بات پہ اتراتے ہو؟ صحت پر اتراتے ہو؟ قوت پر اتراتے ہو؟ کیا مال پر اتراتے ہو؟ کیا علم پر اتراتے ہو؟ ارے ان میں سے کوئی چیز ایسی ہے جس کی ہمیشہ تمہارے پاس رہنے کی گارنٹی ہو؟ بلکہ کسی دینے والے نے دی ہے، وہ جب چاہے واپس لے لے، اس لیے یہ دو چار حرف اس نے سکھا دیے ہیں، وہ اگر آج چھین لے تو تم کیا کر لوگے؟ بس اس کا استحضار اور تکرار کیا جائے جب کبھی دل میں بڑائی کا خیال آئے، بس اس کا دھیان کرلے کہ کسی دینے والے نے یہ وصف اپنے فضل سے دیا ہے، اپنے انعام سے

دیا ہے، تیرا کوئی استحقاق نہیں تھا، کتنے لوگ ہم میں ایسے ہیں جو جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں، اور جس طرح دیا ہے وہ اسی طرح واپس بھی لے سکتا ہے، لہٰذا تیرے لیے اترانے اور اکڑنے کا اور دوسروں پر بڑائی جتلانے کا اور اپنے آپ کو افضل سمجھنے کا کوئی موقع نہیں، ہاں شکر کا موقع ہے کہ اے اللہ! آپ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی، میں اس کا مستحق نہیں تھا، اور میرے قبضۂ قدرت میں نہیں تھا، آپ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے عطا فرمائی، اے اللہ! آپ کا شکر ہے: "اللّٰھم لك الحمد ولك الشکر".

'شکر' بے شمار بیماریوں کا علاج

حضرت ڈاکٹر صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ یہ شکر ایسی چیز ہے کہ یہ بے شمار روحانی بیماریوں کا علاج ہے، جو آدمی شکر کرے گا، وہ کبھی تکبر میں مبتلا نہیں ہوگا، ان شاء اللہ۔ اس لیے کہ شکر کے معنی کیا ہیں؟ شکر کے معنی یہ ہیں کہ یہ نعمت جو مجھے ملی ہوئی ہے، میں اس کے لائق نہیں تھا، میں اس کا مستحق نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے دی ہے، اس کا شکر واحسان ہے۔

اپنے فرض کی ادائیگی شکر کا موقع نہیں

شکر کب کیا جاتا ہے؟ اگر کوئی شخص اپنا فریضہ ادا کرے یا قرضہ ادا کرے، تو کیا قرض خواہ کے ذمہ شکر ادا کرنا واجب ہے؟ مثلاً ایک آدمی مجھ سے ایک ہزار روپے قرض لے گیا، اور یہ کہا کہ دو مہینے بعد واپس کروں گا، یہ احسان تو میں نے کیا کہ میں نے ایک ہزار روپے بطور قرض دیے، اس کو چاہیے کہ میرا شکریہ ادا کرے، پھر جب دو ماہ بعد وہ ایک ہزار روپے مجھے واپس کردے گا، تب بھی احسان دینے والے کا رہا کہ اس نے ایک ہزار روپے دیے تھے اور دو ماہ تک اس ہزار روپے سے اپنے آپ کو محروم رکھا، لہٰذا وہ قرض دار جب واپس لا کر دیا ہے تو وہ کوئی احسان نہیں کر رہا ہے، لہٰذا شکریہ کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا۔

شکر کا موقع یہ ہے

شکریہ اس وقت ادا کیا جاتا ہے جب آدمی اپنے فریضہ سے زیادہ کام کرے، مثلاً ایک ہزار روپے دوسرے کے ذمے واجب تھے، واپس کرتے وقت اس نے ایک ہزار کے بجائے بارہ سو روپے اپنی طرف سے خوش دلی کے ساتھ واپس کردیے، چونکہ اس نے زیادہ دے کر احسان کیا، لہٰذا اس کا شکریہ واجب ہے، جب انسان اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذمے یہ کام ضروری اور واجب نہیں تھا، اور میں اس کا مستحق تو نہیں تھا لیکن اللہ جل جلالہ نے محض اپنے فضل وکرم سے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی، لہٰذا شکر کے اندر خود یہ اعتراف پنہاں ہے کہ میں اس کے لائق نہیں تھا، اور جو شخص لائق نہ ہونے کا اعتراف کرے کیا وہ تکبر میں مبتلا ہوسکتا ہے؟ اس لیے جب بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت ملے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، ان شاء اللہ تکبر کی جڑ کٹتی جائے گی۔

شیطان کے داؤ سے بچنے کا کارگر طریقہ

ہمارے حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ جب شیطان راندۂ درگاہ ہوگیا اور اس نے اللہ تعالیٰ سے کہا: "ثُمَّ لَآتِیَنَّهُم مِّن بَیْنِ أَیْدِیهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَیْمَانِهِمْ وَعَن شَمَائِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِینَ". [سورۃ الاعراف:۱۶]

چونکہ ابن آدم نے مجھے تباہ کیا ہے، اس لیے اس کا بدلہ لینے کے لیے اس سے پاس دائیں سے آؤں گا، بائیں طرف سے آؤں گا، آگے سے آؤں گا، پیچھے سے آؤں گا، اور ابن آدم کو گمراہ کردوں گا، (آخر میں کہتا ہے کہ) آپ ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائیں گے۔ ہمارے حضرت والا فرماتے تھے کہ شیطان چونکہ بڑا اخرانٹ ہے، اس کو یہ معلوم ہے کہ جو آدمی شکر کرنے والا ہوگا، اس کے سامنے میری نہیں چلے گی، اس پر میرا داؤ نہیں چلے گا، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا ہو، اس پر شیطان کا داؤ نہیں چلتا۔

عین پریشانی میں اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی جو نعمت حاصل ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور ایک وقت میں صرف ایک نعمت نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بارش برس رہی ہے: "وَاِن تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا". [سورۃ ابراہیم، آیت/۳۴]

اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو گے تو شمار نہیں کرو گے، انسان چونکہ ناشکرا ہے، اس لیے اگر ذرا سی کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے یا پریشانی آجاتی ہے تو اس کو ہر وقت گاتا رہتا ہے، اور عین اس تکلیف اور پریشانی کے وقت میں اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں متوجہ اور مبذول ہیں، ان کا کوئی ذکر نہیں، ان کی طرف ذرا سا دھیان نہیں، ورنہ عین تکلیف اور پریشانی کے وقت بھی اللہ تعالیٰ کی اتنی نعمتیں ہماری طرف متوجہ ہوتی ہیں کہ ہم ان کا شمار نہیں کرسکتے۔

'شکر' کا ایک انوکھا انداز

ہمارے ڈاکٹر صاحبؒ کے ایک نانا تھے، حضرت والا کی تربیت میں ان کو بھی بڑا دخل رہا ہے، بڑے فاضل اور بزرگوں کے صحبت یافتہ تھے، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں بچپن میں رات کو سونے کے وقت ان کو دیکھتا تو مجھے عجیب

نظر آتا تھا، وہ یہ کہ میرے نانا رات کو سونے کے وقت بستر پر بیٹھ جاتے اور بڑے والہانہ انداز میں پڑھنا شروع کر دیتے: "اللّٰھم لك الحمد ولك الشكر ،اللّٰھم لك الحمد ولك الشكر،اللّٰھم لك الحمد ولك الشكر"۔ مسلسل جھوم جھوم کر کافی دیر تک یہ پڑھتے رہتے، جب میں نے کچھ ہوش سنبھالا تو میں نے ایک دن ان سے پوچھا کہ یہ رات کو سونے سے پہلے آپ کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ سارا دن تو غفلت میں گزر جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں ہوتا، اس لیے میں رات کو سونے سے پہلے بستر پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی ایک ایک نعمت کا تصور کر کے اس پر شکر ادا کرتا ہوں۔

- یا اللہ! آپ نے یہ مکان عطا فرمایا:
اللّٰھم لك الحمد ولك الشكر۔
- آپ نے صحت عطا فرمائی:
اللّٰھم لك الحمد ولك الشكر۔
- آپ نے رزق عطا فرمایا:
اللّٰھم لك الحمد ولك الشكر۔
- آپ نے آرام دہ بستر عطا فرمایا:
اللّٰھم لك الحمد ولك الشكر۔
- آپ نے عافیت عطا فرمائی:
اللّٰھم لك الحمد ولك الشكر۔
- آپ نے بیوی عطا فرمائی:
اللّٰھم لك الحمد ولك الشكر۔
- آپ نے بچے عطا فرمائے:
اللّٰھم لك الحمد ولك الشكر۔

ایک ایک نعمت کا تصور کر کے اس پر شکر ادا کرتا ہوں تا کہ ان نعمتوں کے شکر کا ہزاروں یا لاکھوں حصہ زبان سے ادا ہو جائے۔

سونے سے پہلے شکر ادا کر لو

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ تم بھی ایسا ہی کیا کرو، رات کو سونے سے پہلے تمام نعمتوں کا شکر ادا کر لیا کرو۔ ذرا سا دھیان کرو گے تو سینکڑوں نعمتوں کا استحضار ہو جائے گا، ارے صرف ایک نعمت کو سوچنا شروع کرو گے تو وہ بھی اتنی زیادہ نظر آئے گی کہ ساری عمر بھی سجدے میں پڑے رہو گے تب بھی اس ایک نعمت کا شکر ادا نہیں ہوگا، یہ دو آنکھیں اللہ تعالیٰ نے دی ہیں، ایک آنکھ کو لے لو اور اس کے بارے میں سوچو کہ یہ کیسی نعمت ہے؟ ذرا سا اس میں بال آجائے تب اندازہ ہوگا کہ کیسی نعمت ہے، اسی ایک نعمت کو سوچنا شروع کر دو گے تو حق شکر ادا نہیں ہو سکے گا۔

تکبر سے بچنے ایک چٹکلہ

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میاں! یہ تکبر بڑی خراب چیز ہے، بڑے بڑے معالجوں کو چکر دیدیتی ہے، اس کا علاج کرنا آسان کام نہیں ہے؛ لیکن میں تمہیں ایک چٹکلہ بتا رہا ہوں، اس چٹکلے پر عمل کر لو تو ان شاء اللہ پھر اس تکبر کی بیماری میں مبتلا ہی نہیں ہو گے اور اگر ہو گئے تو ان شاء اللہ جلدی نکل جاؤ گے، وہ چٹکلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو، ہر وقت، ہر لمحے، چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کے شکر کی رٹ لگاؤ، موسم اچھا ہے: اللّٰھم لك الحمد ولك الشكر۔ ہوا چل رہی ہے: اللّٰھم لك الحمد ولك الشكر۔ جو اچھی بات سامنے آئے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو، جتنا جتنا شکر ادا کرو گے، اللہ تکبر سے اتنی ہی حفاظت رہے گی، کہنے کو تو یہ چھوٹا سا چٹکلہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بڑے کانٹے کی بات ہے، اور عمل کرنا بھی اس پر مشکل نہیں، صرف دھیان کرنے اور مشق کرنے کی بات ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆☆☆

دعوتِ نبوی کا رازِ دروں

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کا رازِ دروں یہ ہے کہ اس کے اندر آفاقیت، ابدیت، اور جامعیت پائی جاتی ہے، وہ رنگ و نسل اور ذات پات کی تنگ نائیوں میں محدود نہیں ہے، اس کا پیغام آفاقی اور سب کے لیے ہے اور وہ پوری انسانیت کے مسائل کا حل پیش کرتی ہے، ایک طرف وہ اگر ذکر و عبادت کے طریقے سکھاتی ہے، تو دوسری طرف دیگر ادیان و مذاہب کی تمام انسانی خوبیوں اور شرافتوں کے معیار کو اپنے دامن میں سمیٹنا نہیں بھولتی، وہ انبیاء کے درمیان تفریق و امتیاز کی قائل نہیں، بلکہ سب کا یکساں احترام کرنا سکھاتی ہے، وہ نسل انسانی کے لیے ایک متحدہ مرکز اور ایک پلیٹ فارم رکھتی ہے، اور اس کو ایک ایسی جمعیت میں تبدیل کرنا چاہتی ہے، جو متحد ہو اور یکساں مقاصد کی حامل ہو، پوری کائنات میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جو دین و دنیا کے درمیان فرق و امتیاز نہیں کرتا، بلکہ حسب ضرورت جائز حدود میں رہتے ہوئے دونوں سے فائدہ اٹھانے اور دونوں کے حقوق ادا کرنے کی دعوت دیتا ہے، وہ "مالقیصر لقیصر وما للّٰہ للّٰہ" کے فلسفۂ حیات کو قبول نہیں کرتا۔

☆☆☆

فکر و عمل

آج کی سب سے بڑی قربانی

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی

یہ خبر آج کی نہیں پرانی ہے، اور پرانی بھی کتنی؟ بہت پرانی، یعنی ایک سو دو سال پرانی، خبر کچھ اس طرح ہے ''۱۹/ فروری ۱۹۱۳ء کو تمام ہندوستان میں ترکوں کی فتح کے لیے دعا مانگی گئی اور ترکوں کی امداد کے لیے ہلال احمر قائم کی گئی، اس وقت جوش کا یہ عالم تھا کہ ایک سرحدی عورت نے اپنے نو ماہ کے بچہ کو ہلال احمر کے حوالہ کر دیا اور یہ بچہ ۶۰/ پاؤنڈ میں نیلام کیا گیا''۔

تین سطروں کی یہ ایک چھوٹی سی خبر ہے، ۱۱۰/ سال کی ایک طویل مدت اس پر گذر چکی ہے، جس رسالہ میں یہ خبر شائع ہوئی اس کے کاغذ کی سفیدی پیلاہٹ میں تبدیل ہو چکی تھی اور اس میں چھپے حروف کی سیاہی اپنی چمک کھو چکی تھی، لیکن پیلے سے کاغذ پر پھیکی سی سیاہی کے باوجود چھوٹی سی یہ خبر اس طرح چمک رہی تھی کہ صرف آنکھوں میں نہیں دل کی اندھیری بستی میں بھی اجالا کر رہی تھی۔

یقیناً آپ نے عطیہ کی بہت سی قسمیں دیکھی اور اس کی بہت سی مثالیں سنی ہوں گی، عطیہ رقم کی شکل میں بھی دیا جاتا ہے اور مورنگ اور بالو کی شکل میں بھی، سیمنٹ اور سریوں کی شکل میں بھی دیا جاتا ہے اور اینٹ اور لکڑی کی شکل میں بھی، عطیہ میں گیہوں اور چاول کا بھی استعمال ہوتا ہے اور تیل اور گھی کے پیپوں کا بھی، لحاف اور کمبلوں کی بھی تقسیم ہوتی ہے اور دواؤں اور ہتھیاروں کی بھی۔

ادھر عطیہ کی کچھ اور بھی قسمیں رائج ہو گئی ہیں، مثلاً خون کا عطیہ، آنکھ کا عطیہ، گردے کا عطیہ، دل کا عطیہ، عطیہ کی یہ قسم کہنے کو تو سب سے قیمتی ہوتی ہے، خوب واہ واہ ہوتی ہے، موٹی سی خبر چھپتی ہے، دینے والے کی دل کھول کر تعریف ہوتی ہے، لیکن سچائی تو یہ ہے کہ عطیہ کی یہ قسم ہوتی ہے سب سے معمولی، کیونکہ یہ چیز اس وقت دی جاتی ہیں جب وہ دینے والے کے کام کی نہیں رہتی، ورنہ زندگی میں تو ان اعضاء کی تجارت ہی دیکھی ہے، ان کے ذریعہ اگر ایک غریب کی غربت دور ہوتی ہے تو کسی امیر کو نئی زندگی بھی ملتی ہے، رہا ان اعضاء کا دان کرنا تو اس کا تعلق زیادہ تر وصیت سے ہوتا ہے جو زبانی بھی ہو سکتی ہے اور تحریری بھی، لیکن عمل اس پر صرف اس وقت ہوتا ہے جب صاحب وصیت کے لیے اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

لیکن کیا کبھی آپ نے کوئی ایسا عطیہ دیکھا یا سنا جس میں ایک خاتون نے اپنے نو ماہ کے بچہ کو پیش کیا ہو جس کو اس نے پورے نو ماہ تک اپنے پیٹ میں رکھ کر اپنے خون سے سینچا ہو اور پھر تقریباً دو سال تک اپنا دودھ پلا کر اس کو پالا ہو، جو رات میں اس کے لیے جاگتی اور دن میں اس کے لیے بے قرار رہتی ہو، جو اس تصور کے ساتھ جیتی اور اس خیال کے ساتھ سانس لیتی ہو کہ اس کے جگر کا یہ ٹکڑا، اس کی آنکھ کا یہ تارا اور اس کے بڑھاپے کا یہ سہارا اس کی آنکھ بنے گا جس سے وہ دیکھے گی، اس کا دماغ بنے گا جس سے وہ سوچے گی، وہ اس کے بوڑھے جسم میں جوان دل بن کر دھڑکے گا اور اس کی سوکھتی رگوں میں گرم خون بن کر دوڑے گا، وہ چلے گی تو اس کے پاؤں سے، پکڑے گی تو اس کے ہاتھ سے، بولے گی تو اس کی زبان سے؛ لیکن اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کے اس مرکز کو اس خاتون نے عطیہ میں پیش کر دیا، کس کے لیے؟ ترکوں کے حمایت کے لیے، خلافت عثمانیہ کی بقا کے لیے، مسلمانوں کی عظمت کے اس مینار کی حفاظت اور ان کے اتحاد کی اس روشن علامت کو برقرار رکھنے کے لیے۔

یقیناً خلافت عثمانیہ کا زوال ایک بڑا سانحہ تھا، جس کے نقصانات سالوں نہیں صدیوں پر محیط ہیں؛ لیکن یہ خلافت عثمانیہ کا زوال تھا، اسلام کا نہیں، اس سے مسلمانوں کے وقار کو تو ٹھیس پہنچی؛ لیکن اسلام کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آیا، مسلمانوں کے جذبات تو اس سے مجروح ہوئے؛ لیکن ان کے جذبہ ایمانی اور غیرت دینی میں ایک نیا جوش اور ایک نیا ابال پیدا ہو گیا۔

خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا اور اس کے نتیجہ میں پورے عالم اسلام پر مغربی سامراج کا تسلط قائم ہو گیا، اور عالم اسلام کا وہ اتحاد جو اس کی قوت کی علامت سمجھا جاتا تھا، وہ اتحاد یورپ کی سازش اور اپنوں کی نادانی کے نتیجہ میں پارہ پارہ ہو گیا اور ترکوں کی ناقص جنگی تیاری، نظم و ضبط کی کمی، علم و صنعت سے عدم دلچسپی، عورتوں کے ساتھ بدسلوکی، قائدین کی غلط رہنمائی اور دین سے ان کی بے اعتنائی نے عالم اسلام کو مغرب کی جھولی میں ڈال دیا۔

لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد کرۂ ارض کے نقشہ پر تبدیلی آنا شروع ہوئی اور مغربی سامراج کے شکنجہ سے اسلامی ممالک ایک ایک کر کے آزاد ہونے لگے؛ لیکن یہ آزادی اس آزادی سے مختلف تھی جو مغربی سامراج کے تسلط سے پہلے ان کو حاصل تھی

جس میں ان کے جسم بھی آزاد تھے اور ان کے دل و دماغ بھی، کیونکہ مغربی سامراج نے اتنی بڑی فتح کے باوجود جب اپنے کو پسپائی پر مجبور پایا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ قبضہ کو برقرار رکھنے کے لیے تنہا جنگی سامان کی کثرت، جنگی فنون میں مہارت اور علمی و صنعتی میدان میں برتری کافی نہیں، بلکہ دیرپا فتح کے لیے ضروری ہے کہ جسموں کے بجائے دل و دماغ پر اپنا تسلط جمایا جائے، زمین پر قبضہ کرنے کے بجائے افکار و خیالات پر قبضہ کیا جائے، اور اس بنیاد کو ڈھانے کی کوشش کی جائے جس بنیاد پر بار بار شکست و ریخت کے باوجود مسلمان اپنی نئی تعمیر کرلیا کرتے ہیں۔

چنانچہ انہوں نے کمال ہوشیاری سے اپنی اس اسکیم کو عملی شکل دینا شروع کی اور مسلمانوں خصوصاً نوجوان کے دلوں میں اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے اور قوموں، نسلوں، مسلکوں اور نظریات میں ان کو بانٹ کر ان کا شیرازہ بکھیرنے کی کوشش کی، انہوں نے اسلام پر بے اعتمادی پیدا کرنے، اسلاف کے کارناموں کو مسخ کرنے، ان کی روشن تاریخ کی غلط تصویر پیش کرنے، اپنے خودساختہ نظریات کو اسلامی عقائد کا متبادل بنانے اور اپنے وضع کردہ قوانین و نظام حیات کو آسمانی شریعت اور خدائی دستور سے بہتر ثابت کرنے پر سارا زور صرف کیا، اور ان کی ان کوششوں کا سلسلہ شفاخانوں، تعلیم گاہوں، تحقیقی اداروں اور تصنیفی و تالیفی مراکز کی شکل میں آج بھی جاری ہے۔

ضرورت آج بھی قربانی کی ہے؛ لیکن آج کی قربانی پچھلی قربانی سے مختلف ہے، آج آپ سے مطالبہ یہ نہیں کہ اپنے لخت جگر کو عطیہ میں پیش کیجیے اور اس سے حاصل ہونے والی رقم کسی دینی اور ملی کام میں صرف کیجیے؛ لیکن اتنا مطالبہ ضرور ہے کہ اپنے کسی عمل سے اسلام کو نقصان نہ پہنچائے، اپنے نقصان کو دین کی خاطر گوارہ کر لیجیے، اپنے بچوں کی دینی تعلیم کا بندوبست کیجیے، اسلام کی عظمت ان کے دلوں میں پیدا کیجیے، اسلامی تعلیمات سے ان کو روشناس کرائیے، ان کی علمی، فکری اور دعوتی بنیاد اتنی مضبوط کر دیجیے کہ کوئی باطل تحریک ان کو ہلا نہ سکے۔

آپ اپنی خواہشات سے دستبردار ہو جائیے، عادت و اطوار سے اپنے کو آزاد کرائیے، خاندانی طور وطریق سے اپنا پیچھا چھڑائیے، جاہلی رسم و رواج کی مخالفت اپنا شعار بنائیے، اور اپنے ہر کام، ہر معاملہ اور ہر مسئلہ میں شریعت کو حکم بنانے پر فخر محسوس کیجیے، ملت کو اپنی ذات پر ترجیح دیجیے، ذاتی اغراض ومقاصد سے بلند ہو کر مذہبی وملی کاموں کے لیے کچھ وقت ضرور نکالیے، کسی بھی کام میں ناک کو بیچ میں نہ لائیے، برائی کا جواب اچھائی سے، قطع رحمی کا جواب صلہ رحمی سے، نفرت کا جواب محبت سے، اختلاف کا جواب اتحاد سے، حق تلفی کا جواب حق کی ادائیگی سے دیجیے، یہی آج کی سب سے بڑی قربانی ہے، اور اس وقت اس کی سب سے زیادہ کمی ہے۔

اس وقت کمی نہ علم کی ہے، نہ عقل کی، نہ ہمت کی، نہ شجاعت کی، نہ تسبیحات کی، نہ تکبیرات کی، نہ تحریکوں کی، نہ تنظیموں کی، نہ مدرسوں کی، نہ خانقاہوں کی، نہ کالجوں کی، نہ یونیورسٹیوں کی، نہ ڈگریوں کی، نہ تجربات کی، کمی ہے تو صرف اعتدال کی، توازن کی، بھروسہ کی، ہوشمندی کی، معاملہ فہمی کی، قوت برداشت کی، باہمی اعتماد کی، چہروں پہ یقین کے نور اور آنکھوں میں سرور عشق کی اور سب سے بڑھ کے حسد، کینہ، بغض اور نفاق سے پاک دل کی۔

ضرورت ہے اس کمی کو دور کرنے اور ان عیوب سے اپنا پیچھا چھڑانے کی، ورنہ خودرائی، خودپسندی، نفس پرستی، گروہ بندی اور جاہ طلبی کے روگ کے ساتھ ترقی اور کامیابی کے خواب دیکھنا حماقت کے سوا کچھ نہیں، مال کی قربانی، جان کی قربانی اور وقت کی قربانی اسی وقت رنگ لائے گی اور اس کے بہتر نتائج اسی وقت سامنے آئیں گے جب ہم اپنی ان خامیوں کو دور کرکے اپنی ان کمزوریوں پر قابو پائیں گے، اور اپنی ذات کو ملی مفاد کی راہ میں کبھی حائل نہ ہونے دیں گے:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

☆☆☆☆☆

ایک سرمدی نعمت

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

''سنت نبوی'' وہ سرمدی نعمت ہے، جس سے زندگی گزارنے کا قرینہ نصیب ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں ان تمام گوشوں کی طرف بھرپور رہنمائی فرمادی جن کی انسان کو ضرورت ہوتی ہے، روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے ایک صحابی سے کہا کہ تمہارے نبی عجیب ہیں وہ تمہیں قضائے حاجت کا طریقہ بھی سمجھاتے ہیں، صحابیؓ نے جواب دیا: ہاں، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہم کو یہ تمام باتیں سکھلاتے ہیں، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ غیروں میں بھی اس بات کے خوب تذکرے تھے کہ یہ وہ نبی ہیں جو اپنے متبعین کو زندگی کا ایک ایک جزئیہ سکھاتے ہیں اور ان کے ماننے والے بلاتردد اس پر بخوشی عمل کرتے ہیں۔ ☆☆☆

احوال و آثار

پروپیگنڈہ کو سمجھیں اور برادرانِ وطن تک سچائی پہنچائیں

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

کسی بات کو مخاطب تک مؤثر طور پر پہنچانے کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ صرف آواز کے ذریعہ مخاطب کے کانوں تک اپنی آواز پہنچائی جائے، دوسرے یہ کہ بالمشافہ آمنے سامنے اپنی بات کہی جائے، پہلی صورت میں دور تک بات پہنچائی جاسکتی ہے، خاص کر ٹیلی فون وغیرہ کے ذریعہ، دوسری صورت میں اگرچہ آپ دور تک اپنی بات نہیں پہنچا سکتے؛ لیکن جب آپ کوئی بات کہتے ہیں تو اس میں آواز اور الفاظ کے ساتھ چہرے کے نقوش بھی شامل ہوتے ہیں، الفاظ اور نقوش مل کر مخاطب پر زیادہ اثر ڈالتے ہیں؛ لیکن اس طریقہ پر آپ اسی شخص سے اپنی بات کہہ سکتے ہیں، جو آپ کے سامنے ہو، جس سے دو چار فٹ یا کچھ زیادہ فاصلہ ہو، اس سے خطاب نہیں کر سکتے؛ مگر موجودہ دور میں ابلاغ کے میدان میں جو ترقی ہوئی ہے، اس نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ آپ دور دور تک اپنی آواز بھی پہنچا سکتے ہیں، اپنے چہرے کے نقوش بھی اور مضمون کے اعتبار سے اپنے جسم کی حرکت بھی، اور یہ ہے ڈیجیٹل تصویروں کا وسیلہ؛ چنانچہ فلموں اور انٹرنیٹ پروگراموں کے ذریعہ آپ اپنی بات سمندر پار تک پہنچا سکتے ہیں اور شب و روز پہنچائی جارہی ہے۔

اگر اس قوت کا استعمال بہتر مقاصد کے لیے ہو تو دنیا خیر اور بھلائی سے معمور ہو جائے، سماج کی اصلاح، لوگوں کو اخلاق کے سانچے میں ڈھالنے، صالح معاشرہ کی تشکیل، اچھی باتوں کی ترغیب اور بری باتوں سے روکنے اور بچانے کا اس وقت شاید اس سے زیادہ مؤثر ذریعہ نہیں ہے؛ مگر افسوس کہ آج اس عظیم ٹیکنالوجی اور مفید وسیلہ کا استعمال خیر سے زیادہ شر کے لیے اور بھلائی سے زیادہ برائی کے لیے ہو رہا ہے، پہلے نفرت پیدا کرنے کے لیے غیبت کا سہارا لیا جاتا تھا، اور لوگ چپ چاپ کسی کی برائی بیان کرتے تھے، پھر اس کے لیے خفیہ میٹنگیں ہونے لگیں، جس میں سو پچاس افراد رازداری کے ساتھ سازشوں کے جال بُنا کرتے تھے، پھر اس مقصد کے لیے دھواں دار تقریریں ہونے لگیں، بڑے بڑے جلسے منعقد ہونے لگے، خاص کر سیاسی طالع آزماؤں نے اپنی ناکارگی کو چھپانے کے لیے اس کا بہت استعمال کیا، اب اس مقصد کے لیے ریلیاں بھی کی جاتی ہیں، پرنٹ اور ڈیجیٹل میڈیا کے ذریعہ اشتہارات بھی نشر کیے جاتے ہیں، جھوٹ پر مبنی فرضی ڈبیٹ بھی رکھے جاتے ہیں، اور علی الاعلان لوگوں کو محبت کی بجائے نفرت کی دعوت دی جاتی ہے۔

اب اس نفرت آمیز طرز عمل کو مزید مؤثر بنانے اور اس کے دائرہ کو وسیع کرنے کے لیے فلموں کا سہارا لیا جارہا ہے، نوجوان زیادہ فلم بینی کے شائق ہوتے ہیں، کوئی نوجوان دو گھنٹے خاموشی کے ساتھ بیٹھ کر تقریر نہیں سن سکتا؛ لیکن فلم دیکھ سکتا ہے؛ اس لیے اب من گھڑت اور نفرت انگیز کہانیوں کو بنیاد بنا کر فلمیں تیار کی جاتی ہیں، اس سے پہلے کشمیر اور کیرالا کے سلسلے میں سراسر جھوٹ پر مبنی فلمیں بنائی گئیں، خود سرکاری محکموں نے اس کے خلاف واقعہ ہونے کا اعتراف کیا؛ لیکن چوں کہ اس کا نشانہ مسلمان تھے، اور مسلمانوں کے خلاف ستر خون معاف ہیں؛ اس لیے حکومت نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔

اب معلوم ہوا ہے کہ ایک نئی فلم ''ہمارے ۱۲'' کے عنوان سے آرہی ہے، جس کا ٹریلر یوٹیوب پر آچکا ہے، اس میں سب سے پہلے ایک مولوی نما شخص علماء کا معروف لباس پہن کر اور سر پر عمامہ کے ساتھ بہت ہی قوت کے ساتھ قرآن مجید کی آیت: ''نِسَائُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ ''[سورہ بقرہ:۲۲۳] (تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیتیاں ہیں؛ لہٰذا تم اپنی کھیتی پر آؤ جس طرح چاہو)۔

کی تلاوت کرتا ہے، پھر مختلف مکروہ منظر پیش کیے جاتے ہیں، ایک عورت حاملہ ہے اور چاہتی ہے کہ شوہر ابھی اس سے جسمانی تعلق قائم نہ کرے؛ مگر شوہر زور زبردستی کر کے جسمانی تعلق قائم کرنا چاہتا ہے، ایک عورت کافی بیمار ہے، اپنے شوہر سے معذرت کرتی ہے، پھر بھی شوہر زور زبردستی کر کے اس سے جسمانی رشتہ قائم کرنے کے درپے ہے، اسی طرح کے مختلف مناظر ہیں، ہر منظر میں مرد کو مسلمان شخص کی صورت میں دکھایا گیا ہے، اور عورت کو برقعہ میں؛ تاکہ دیکھنے والے جان لیں کہ ایسی حرکتیں مسلمان کیا کرتے ہیں، پھر یہ تأثر دیا گیا ہے کہ اسی وجہ سے مسلمانوں کے یہاں زیادہ بچے ہوتے ہیں، مسلمان بیوی بارہ بچے پیدا کرتی ہے، پہلے حکومت کے ذمہ دار لوگوں نے ہم پانچ اور ہمارے پچیس اور ہمارے چالیس جیسا خلاف واقعہ نعرہ دیا تھا، اب اس فلم میں ایک طرف

عورتوں پر ظلم دکھایا گیا ہے، اور دوسری طرف اولاد کی کثرت دکھائی گئی ہے۔

اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ہمیں قرآن وحدیث کی طرف رجوع کرنا چاہیے، اور برادران وطن کی کتابوں کا بھی جائزہ لینا چاہیے، سورۂ بقرہ کی اس آیت کے نازل ہونے کا سبب یہ ہے کہ اسلام کے پہلے سے مکہ میں لوگ میاں بیوی کے جسمانی تعلق کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتے تھے، سامنے کی طرف سے، پشت کی طرف سے، بیٹھ کر اور کروٹ کی شکل میں، عورت کی پیٹھ کے بل لیٹنے یا پیٹ کے بل لیٹنے کی حالت میں؛ لیکن بہر حال یہ تعلق عورت کی آگے کی شرمگاہ میں ہی قائم کیا جاتا تھا، یہودیوں کے یہاں ایک ہی طریقہ کی قید تھی، مختلف انداز سے شوہر اور بیوی ایک دوسرے سے لطف اندوز نہیں ہوسکتے تھے، یہود مدینہ میں رہتے تھے اور مدینہ میں انصار مدینہ کا بھی قیام تھا، تو انصار کے یہاں بھی یہی مزاج تھا، شوہر وبیوی کے تعلق میں ایک ہی طریقہ کی پابندی ہوتی تھی، جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائے، تو ایک مہاجر مرد کی ایک انصاری عورت سے شادی ہوئی اور انھوں نے جسمانی تعلق میں اہل مکہ کے طریقہ کے مطابق مختلف انداز پر بیوی سے لطف اندوز ہونا چاہا، یہ بات اس خاتون کو ناگوار گزری، انھوں نے کہا کہ مجھے یہ گوارا نہیں ہے، اگر تم کو ایسا کرنا ہے تو مجھ سے دور رہو، یہ اختلاف دوسرے لوگوں تک بھی پہنچا، یہاں تک کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک بھی، اسی موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی کہ بیویاں اپنے شوہروں کے لیے کھیتی کے درجہ میں ہیں، تو جس طریقہ پر وہ چاہیں اپنی کھیتی پر آئیں، یعنی شوہر کسی بھی طریقہ پر بیوی کے اس حصۂ جسم میں اپنا مادہ تولید ڈال سکتا ہے، جس میں بچہ کی نشو ونما ہوتی ہے اور طرفین کو اولاد کی نعمت حاصل ہوتی ہے، [الکشف والبیان عن تفسیر القرآن، سورۃ البقرۃ، بروایت ابن عباس] یعنی اس میں کیفیت کا عموم ہے کہ جس کیفیت کے ساتھ چاہے صحبت کرے، مقام کا عموم نہیں ہے، وہ تو متعین ہے کہ جس راہ سے حمل کا استقرار ہو سکتا ہے، اسی کا استعمال کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے؛ بلکہ اس میں سیدھی سادھی بات کہی گئی ہے کہ ایک تو انسان فطری طور پر صنفی تعلق کی ضرورت محسوس کرتا ہے، اس تعلق کو قائم کرنے کی اجازت ہے، دوسرے اولاد کی طلب ایک فطری جذبہ ہے؛ اس لیے مرد کو اپنی بیوی سے اولاد کے لیے تعلق قائم کرنا چاہیے، ہر مذہب اور مہذب سماج میں اس کو تسلیم کیا گیا ہے، خود ہندو سماج میں بھی یہی تعلیم دی گئی ہے؛ چنانچہ: یجروید میں ہے:

''اے نیشو! جیسے بیل گایوں کو گابھن کر کے نسل بڑھاتا ہے، ویسے ہی گرہستی لوگ استریوں کو حمل رکھا کر پرجا بڑھاویں'' [یجروید بھاش، حصہ سوم، ادھیائے ۲۸، منتر ۳۲، صفحہ: ۲۹۴، اردو ترجمہ: مطبع نگم پرکاش مسجد سوٹھہ ضلع دہلی]

ہندو مذہب میں اولاد کے حصول کے جذبہ کو کتنی اہمیت دی گئی ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے ہندو مذہب میں ''نیوگ'' کا قانون کافی ہے، پنڈت دیانند سرسوتی جی نے ہندو مذہبی کتابوں کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ بیوہ عورت کو بھی اپنے دیور کے ساتھ جسمانی تعلق قائم کر کے اولاد حاصل کرنی چاہیے:

''اے بیوہ عورت! اپنے اس مرے ہوئے اصل خاوند کو چھوڑ کر زندہ دیور یعنی دوسرے خاوند کو قبول کر، اس کے ساتھ رہ کر اولاد پیدا کر، وہ اولاد جو اس طرح پیدا ہوگی تیرے اصلی خاوند کی ہوگی'' [ستیارتھ، ب: ۴، دفعہ: ۱۳۳]

بلکہ بات اس سے بھی آگے جاتی ہے کہ نیوگ کے نام پر شوہر کی زندگی میں بھی دوسرے مرد سے تعلق قائم کر کے عورت کو اولاد پیدا کرنی چاہیے؛ چنانچہ پنڈت جی دیانند سرسوتی کہتے ہیں:

''نیوگ جیتے جی بھی ہوتا ہے، جب خاوند اولاد پیدا کرنے کے ناقابل ہو، تب اپنی عورت کو اجازت دے کہ اے نیک بخت اولاد کی خواہش کرنے والی عورت! تو مجھ سے علاوہ دوسرے خاوند کی خواہش کر؛ کیوں کہ اب مجھ سے تو اولاد نہ ہو سکے گی، تب عورت دوسرے کے ساتھ نیوگ کر کے اولاد پیدا کرلے'' [ستیارتھ، ب: ۴، دفعہ: ۱۳۸]

ان صراحتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندو مذہب میں اولاد کے حصول کو کتنی اہمیت دی گئی ہے، مہابھارت کے بیان کے مطابق بھگوان واسودیو جی کی سولہ ہزار ایک سو رانیاں ہیں، جن میں آٹھ رانیاں زیادہ مشہور تھیں، [مہابھارت، انش: ۴-۱۵] شری کرشن جی کی بھی سولہ ہزار رانیاں تھیں [مہابھارت انش: ۵-۲۸] ہندو مذہب کی اصل تعلیمات کے مطابق برہمن کو چار، چھتری کو تین، ویش کو دو، شودر کو ایک اور بادشاہ کو جتنی بیویاں رکھنا چاہے اتنی بیوی رکھ سکتا ہے، ظاہر ہے کہ جب بیویاں اتنی بڑی تعداد میں ہوں گی تو اولاد بھی اسی نسبت سے ہوگی، پھر مسلمانوں کی اولاد پر اتنی آہ وبکا کیوں؟ اگر موجودہ دور کے قد آور سیاسی لیڈروں خاص کر سنگھ پریوار سے جڑے ہوئے رہنماؤں کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو ان میں بہت سے وہ ہیں، جن کی بیویاں ایک سے زیادہ ہیں، اور بہت سے وہ ہیں کہ خود اُن کے خاندان میں بچوں کی پیدائش اچھی خاصی

ہے، ایک سیاسی مقرر نے حال ہی میں علی الاعلان بتایا کہ فلاں فلاں لیڈروں کے سات بھائی بہن اور ایک تنظیم کے چیف کے چار بھائی بہن ہیں، اور فلاں کے تو ایک درجن بچے تھے، یہ بات ڈنکے کی چوٹ پر کہی گئی اور ان میں سے کسی کو اس کی تردید کی جرأت نہیں ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ مسلمانوں کے یہاں دوسرے سماج کے مقابلہ زیادہ اولاد پیدا کرنے کی منصوبہ بند کوشش ہوتی ہے اور نہ قرآن مجید میں شوہر و بیوی کے تعلق کے سلسلہ میں جو ہدایت دی گئی ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ عورت اپنی صحت اور حالات کی رعایت کیے بغیر شوہر کے جنسی استفادہ کے لیے اپنے آپ کو پیش کرے اور وہ اس سے انکار نہیں کر سکتی، فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ بیوی سے اس کی صلاحیت اور طاقت سے زیادہ جسمانی رشتہ قائم کرنا جائز نہیں ہے: ولو تضررت من كثرة جماعه لم تجز الزيادة على قدر طاقتها [ردالمحتار] اور امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ اگر عورت بیمار ہو یا اس کو زخم ہو تو وہ شوہر کو جسمانی استفادہ سے روکنے میں حق بجانب ہوگی: ولو كانت مريضة أو كان بها قرح يضرها الوطء فهي معذورة في الامتناع عن الوطء [روضۃ الطالبین] اس لیے یہ تأثر دینا کہ مرد و عورت کے تعلق میں مرد کو مکمل من مانی کرنے کا حق دیا گیا ہے، سراسر غلط ہے، اور یہ شریعت کے مزاج ہی سے مطابقت نہیں رکھتا۔

قرآن مجید کا بیوی کو کھیتی سے تشبیہ دینا ایک لطیف اشارہ ہے، کاشت کار کو اپنی کھیت سے بڑی محبت ہوتی ہے، وہ اس کی حفاظت کرتا ہے، نقصان دہ چیزوں سے اسے بچاتا ہے، اور ہر طرح سے اس کی دیکھ ریکھ کا لحاظ کرتا ہے، پھر موسم پر اس سے پھل حاصل کرتا ہے، اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ شوہر کا بیوی سے صرف یہ تعلق نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اپنی خواہش پوری کرے اور دور ہٹ جائے اور بیوی کے مسائل اور ضروریات سے بے تعلق ہو جائے، پھر جب بچہ پیدا ہو تو اولاد کی نسبت کا طلب گار ہو؛ بلکہ اس کو قدم قدم پر بیوی کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہیے، اس کی حفاظت اور نگہداشت کرنی چاہیے، اس کا علاج اور اس کی غذا کا معیاری انتظام کرنا چاہیے، اس کو پوری محبت اور توجہ دینی چاہیے، پھر اس کا پھل یعنی اولاد حاصل کرنی چاہیے، شوہر کا اپنی بیوی سے ایسا تعلق نہ ہو جو جانوروں میں نر اور مادہ کا ہوتا ہے کہ نر و مادہ کا تعلق قائم ہو گیا، اس کے بعد نر کو مادہ سے کوئی تعلق نہیں، نہ اس کی غذا سے نہ اس کے لیے رہائش کے انتظام سے، نہ اس کے علاج وضروریات سے؛ بلکہ اس کا تعلق ایسا ہونا چاہیے جیسا ایک کاشتکار کا اپنے کھیت سے ہوتا ہے، اور اس میں اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ عورت صرف لذت حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہے؛ بلکہ وہ شریک حیات ہے، جس سے جسمانی تعلق بھی بہتر اور جائز مقصد کے لیے ہونا چاہیے، جس میں دائمی محبت اور ایک دوسرے کا لحاظ ہو، افسوس کہ قرآن مجید کے اتنے اہم حکم کو اس کی روح کے برخلاف منفی انداز میں پیش کیا جا رہا ہے، مسلمانوں کو چاہیے کہ اس پروپیگنڈہ کی حقیقت کو خود سمجھیں اور برادرانِ وطن تک بھی سچائی کو پہنچائیں؛ تاکہ جھوٹ کا پردہ چاک ہو؛ کیوں کہ جب صبح کی روشنی طلوع ہوتی ہے تو رات کی تاریکی چھٹ جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆

رضائے الٰہی کا راز

مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

صحابہ کرامؓ کی جو زندگی تھی وہ یہی تھی کہ کچھ ملے یا نہ ملے، رضی اللّٰہ عنهم ورضوا عنه، اللہ میاں نے دنیا ہی میں ان کو رضامندی کا پروانہ دے دیا، وہ اللہ سے راضی، اللہ ان سے راضی، اور جو اللہ سے راضی اللہ اس سے راضی، صحابہ کرام کو کہا گیا: رضی اللّٰہ عنهم ورضوا عنه، اللہ سے وہ راضی، تو جب اللہ سے وہ راضی، اللہ ان سے راضی۔ یہاں پر اس سے یہ بات سمجھنا چاہیے کہ ہم میں سے بھی جو شخص دنیا سے اخلاص کے ساتھ جائے اور شرک نہ کرے، نماز قائم کرے، زکاۃ دے، جب یہ سب اعمال وہ کرے گا تو گویا کہ وہ اللہ سے راضی ہو گیا، اور جب وہ اللہ سے راضی ہو گیا، تو اللہ اس سے راضی ہو گیا، اور جو اللہ کے لیے کوئی کام شرک سے بچتے ہوئے کرے گا، تو اللہ اس سے ضرور راضی ہوگا، یہ یاد رہے کہ اگر شرک کر لیا تو پھر اس کے بعد تو چاہے کوئی بھی شخص جتنا بھی اچھا کام کر لے کوئی بھی عمل قابل قبول نہیں ہو سکتا، اس لیے شرک سب سے خطرناک اور ناپاک، گندی و پلید چیز ہے، اس سے زیادہ گھناؤنی کوئی چیز پیدا نہیں ہوئی ہے، اس سے تو بچنا ہی بچنا ہے، جب اس سے بچ جائے، اور نیت درست کر لے اور نماز قائم کر لے، زکاۃ دیتا رہے، تو اللہ تعالیٰ نے گویا کہ اس کو رضامندی کا پروانہ دے دیا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اعمال صالحہ میں خلوص اور اپنی رضامندی کی توفیق نصیب فرمائے، آمین۔

☆☆☆

محاسنِ اسلام

جامع عبادت اور اسلامی زندگی کا تربیتی نصاب

ڈاکٹر سراج الدین ندوی

تمام مذاہب میں کسی مقدس مقام کا سفر عبادات میں شامل ہے۔ یہودیت میں ہیکل سلیمانی کی زیارت اور اس کا طواف کیا جاتا ہے۔ عیسائیت میں بیت المقدس کی زیارت کا افضل سمجھا جاتا ہے۔ سکھ مذہب میں گولڈن ٹیمپل اور بودھ دھرم میں لمبینی، سارناتھ، کشی نگر اور گیا کے مہابودھی مندر کی زیارت باعث اجر وثواب ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں ہمارے وطنی بھائی کاشی، متھرا، ہری دوار، چاردھام کی یاترا کرتے ہیں اور وہاں جاتے وقت بہت معمولی لباس پہنتے ہیں۔ وہاں اپنے معبودوں کا طواف (پری کرما) کرتے ہیں، وہاں موجود دریا، ندی یا تالاب میں نہاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ سارے پاپ دھل گئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب حج کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے دور سے ہی ہر نبی اور اس کی امت نے مناسک حج ادا کیے ہیں۔ یہاں تک مشرکین عرب بھی ہر سال مناسک حج ادا کرتے تھے اور حج کے موقع پر مکہ مکرمہ میں ایک بڑے میلے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاح معاشرہ کے فرض کو انجام دیا تو حج کے ساتھ جو غیر ضروری رسمیں در آئی تھیں آپ نے مناسک حج کو تمام آلودگیوں سے پاک کیا اور حج کو تقرب الٰہی کا ذریعہ بنایا۔

اسلام میں حاجی اللہ کے گھر کعبہ کا سفر کرتے ہیں، وہاں بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں، زم زم کے پانی سے سیراب ہوتے ہیں اور حج کرنے کا ثواب بھی یہی بتایا گیا ہے کہ انسان گناہوں سے ایسے پاک ہوجاتا ہے جیسے کہ وہ آج ہی اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔

حج کے لغوی معنیٰ ہیں ''ارادہ کرنا'' اور دین کی اصطلاح میں حج اس عبادت کو کہتے ہیں جس میں ایک مسلمان کعبہ کی زیارت کا ارادہ کرتا ہے۔ جس کے پاس اتنی رقم ہو کہ وہ حج کے اخراجات اور واپس آنے تک گھر والوں کے خرچ کے لیے کافی ہو اس پر حج فرض ہے۔ قرآن کریم میں اللہ کا فرمان ہے: ''اللہ کے لیے ان لوگوں پر اللہ کے گھر کا حج فرض ہے جو وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہیں''۔ [آل عمران]

احادیث میں بھی حج کی فرضیت پر زور دیا گیا ہے اور حج کو ارکانِ اسلام میں شمار کیا گیا ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے :۱- توحید و رسالت کی گواہی، ۲- نماز قائم کرنا، ۳- ادائیگی زکوٰۃ، ۴- رمضان کے روزے، ۵- اور حج۔ [صحیح مسلم]

تمام علمائے حدیث اور ائمہ فقہ کا اس کے فرض ہونے پر اتفاق ہے۔ کوئی مسلمان بھی اس کی فرضیت کا منکر نہیں ہے۔ اگر کوئی اس کی فرضیت کا انکار کرتا ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے۔

حج ایک جامع عبادت اور اسلامی زندگی کا تربیتی نصاب ہے۔ اس میں ذکر و دعا، نماز، زکوٰۃ، روزہ، ہجرت اور جہاد جیسی تمام اہم اور بنیادی عبادات کی روح اور تربیتی مقاصد واثرات موجود ہیں۔ اس عبادت کی ابتدا لَبَّیْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّیْكَ سے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے اذکار کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔ بالخصوص یوم عرفہ تو ہے ہی ذکر و دعا اور توبہ واستغفار کا دن۔ منیٰ میں قیام کے دوران بھی ذکر کی خاص تاکید کی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

''پھر جب تم جوق در جوق عرفات سے واپس ہونے لگو تو اللہ کا ذکر مشعر حرام کے پاس کرلیا کرو اور اس کا ذکر اس طرح کرو جس طرح کرنے کی اس نے تمھیں ہدایت کی ہے اور اس سے پہلے تم راہ بھولے ہوئے تھے، پھر تم اسی جگہ سے واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بے شک اللہ گناہ معاف فرمانے والا اور مہربان ہے۔ پھر جب تم حج کے تمام مناسک ادا کرچکو تو اللہ کا ذکر اسی طرح کرو جس طرح تم اپنے باپ دادا کا ذکر کیا کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ''۔ [سورہ بقرہ:۱۹۹]

حاجی اللہ کے جس گھر کی طرف منہ کرکے عمر بھر نماز پڑھتا رہا ہے آج وہ اسے دیکھنے کی سعادت حاصل کرتا ہے۔ اس کا طواف کرتا ہے اور اس کے مالک کے حضور سجدہ ریز ہوکر اس سے بہت قریب ہوجاتا ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں زکوٰۃ وصدقات دیتا رہا ہے، سفر حج میں اپنے محبوب مال کا بڑا حصہ خرچ کرکے مال کی محبت کو اللہ کی محبت پر قربان کرتا ہے۔ وہ روزہ میں جن شہوات و خواہشات کو اللہ کی مرضی کے تابع کرتا ہے اور تراویح وقیام میں جیسا سخت مجاہدہ کرتا ہے، اس کی تربیت احرام کی پابندیوں اور حج کے پُر مشقت مناسک میں موجود ہے۔

ہجرت کی حقیقت ترک وطن، اہل وعیال سے جدائی، سفر کی مشقت، دنیوی مفادات کی قربانی اور اللہ کے حکم پر لبیک کہنا ہے۔ حج میں بھی بندہ لَبَّیْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّیْكَ کی ایمان پرور صدا بلند کرتے ہوئے

پوری شان بندگی کے ساتھ اپنے گھر سے اللہ کے گھر کی طرف اور اپنے وطن سے اس شہر کی طرف روانہ ہوتا ہے جس میں اللہ کے شعائر (نشانیاں) ہیں اور جس کا حج اس پر فرض ہے۔

جہاد کی بہت سی خصوصیات بھی حج میں موجود ہیں۔ جہاد کے لیے سفر کرنا پڑتا ہے، مجاہد سر پر کفن باندھ کر محاذ جنگ پر جاتا ہے، کبھی ایک محاذ پر مصروف جہاد ہوتا ہے اور کبھی دوسرے محاذ پر دشمن سے لڑتا ہے۔ اس فرض کو ادا کرنے میں وہ اتنا مصروف ہوتا ہے کہ اسے اپنا ہوش نہیں رہتا، نہ وہ سر میں تیل ڈالتا ہے، نہ ہی کپڑوں پر توجہ دیتا ہے، نہ پوری طرح نیند لیتا اور آرام کرسکتا ہے، نہ وقت پر کھانا کھاسکتا ہے۔ یہاں تک کہ وقت پر نماز بھی نہیں پڑھ سکتا۔ اس راہ میں اللہ کے کچھ بندے شہید بھی ہوجاتے ہیں۔ حج میں بھی سفر کی تکان، کفن نما لباسِ احرام، احرام کی پابندیاں، مکہ سے منیٰ، منیٰ سے عرفات، عرفات میں ظہر کے ساتھ نماز عصر اور مزدلفہ میں مغرب کی نماز، عشاء کے ساتھ پڑھنا، عرفات سے مزدلفہ اور پھر منیٰ مقررہ وقت پر پہنچنا، جمرات پر کنکریاں مارنا اور جانور کی قربانی کرنا، بعض حاجیوں کا مناسک کی تھکن، گرمی کی شدت اور بھیڑ کی وجہ سے انتقال کرجانا جہاد کا پرتو ہے۔ اس لیے کمزوروں کا جہاد حج کو قرار دیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''ہر کمزور کا جہاد حج ہے۔'' [مسند الشہاب]

حج ایک غلام کی عاجزی و انکساری اور عبدیت کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ خدا کے دربار میں حاضر ہونا، کفن نما کپڑا پہننا، اللہ کے گھر کا چکر لگانا، صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا، عرفات و مزدلفہ کے صحراؤں میں پڑاؤ ڈالنا، جمرات پر کنکریاں مارنا، بلند آواز میں تلبیہ کہنا اور اس قسم کے بہت سے اعمال انجام دینا بندگی اور عبدیت کا بہترین مظہر ہیں۔ یہ اللہ سے محبت کی معراج ہے۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کے عشقِ خداوندی کی اداؤں کا احیاء ہے اور اسلام کا آخری رکن ہے۔

حج کو اجر و ثواب کے لحاظ سے بڑی فضیلت و اہمیت حاصل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے حج کیا اور اس نے کوئی شہوانی اور فحش کام نہ کیا اور نہ ہی خدا کی نافرمانی کی تو وہ گناہوں سے ایسا پاک و صاف ہوکر واپس لوٹتا ہے جیسا اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اس کو جنا تھا''۔ [بخاری و مسلم]

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے لوگو! تم پر حج فرض کیا گیا ہے اس لیے حج کرو۔ ایک شخص نے سوال کیا: ''اے اللہ کے رسولؐ کیا ہر سال حج کرنا فرض قرار دیا گیا ہے؟'' اس نے تین بار یہی سوال دہرایا۔ آپؐ نے فرمایا: ''اگر میں ''ہاں'' کہہ دیتا تو ہر سال حج فرض ہوجاتا اور تمہارے اندر اس کی استطاعت نہیں ہے۔'' اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: ''جو چیزیں میں بیان نہ کروں اس کے سلسلہ میں مجھ سے سوال مت کیا کرو اور مجھے آزاد چھوڑ دیا کرو۔ تم سے پہلی امتوں کے لوگ اسی لیے تباہ ہوگئے کہ وہ اپنے نبیوں سے بہت زیادہ سوالات کرتے تھے۔ پھر ان کے احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ لہٰذا جب میں تم کو کسی چیز کا حکم دوں تو طاقت بھر اس کی تعمیل کرو اور جب کسی چیز سے روکوں تو اس کو چھوڑ دو''۔ [مسلم] ایک بار نبی کریمؐ سے معلوم کیا گیا کہ کون سا عمل سب سے بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

''اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانا'' پھر دریافت کیا گیا اس کے بعد کون سا عمل بہتر ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا'' عرض کیا گیا اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''حج مبرور''۔

حج مبرور وہ حج ہے جو بارگاہِ ایزدی میں مقبول ہو اور بارگاہِ ایزدی میں وہی حج مقبول ہوتا ہے جو صرف خدا کی خوشنودی کے لیے کیا جائے اور ہر قسم کی فحاشی و بے حیائی اور فسق و فجور سے پاک ہو۔

بخاری و مسلم میں نبی کریمؐ کا یہ ارشاد موجود ہے: ''حج مبرور کا بدلہ جنت ہی ہے۔'' آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

''حج اور عمرے کو پے در پے کرو کیوں کہ یہ دونوں محتاجی اور گناہوں کو ایسا دور کردیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے، چاندی اور سونے کے میل کچیل کو دور کردیتی ہے اور مقبول حج کا بدلہ جنت کے سوا کچھ نہیں''۔ [مشکوٰۃ]

حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص کے پاس حج کے لیے ضروری سامان اور ایسی سواری میسر ہو جو اسے بیت اللہ تک پہنچا سکے اور پھر بھی وہ حج نہ کرے تو اس میں کوئی فرق نہیں کہ وہ یہودی ہوکر مرے یا نصرانی ہوکر مرے''۔ [ترمذی]

مطلب واضح ہے کہ اگر کوئی شخص اس حال میں مرجائے کہ اس نے حج فرض ہونے کے باوجود حج ادا نہ کیا تو اس حال میں مرنا یہودی اور نصرانی ہوکر مرنے کے برابر ہے۔ جس طرح نماز چھوڑنے کو کفر و شرک کے قریب تر بتایا گیا ہے۔ اسی طرح حج ادا نہ کرنے کو یہود و نصاریٰ کے عمل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کیوں کہ یہود و نصاریٰ حج نہیں کرتے تھے، جب کہ مشرکین عرب حج تو کرتے تھے مگر نماز نہیں پڑھتے تھے۔ اس لیے ترکِ نماز کو شرک سے قریب بتایا گیا۔ ارشاد ہوا: ''نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے مت ہوجاؤ''۔ [سورہ روم]

☆☆☆☆☆

بیتِ عتیق

حرمِ کعبہ: پہلا گھر خدا کا

نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی

اسلام میں کعبہ شریف کو نہایت بلند مرتبہ اور مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ دین کے بنیادی ارکان خمسہ میں سے دو ارکان -نماز اور حج -تو اسی مقدس خانہ خدا سے مربوط ہیں۔ یہ اہل اسلام کا قبلہ ہے۔اس باب میں مسلمانوں کے تمام فرقے ومسالک متحد ہیں۔ یہ ایک تسلیم شدہ سچائی ہے کہ مکہ مکرمہ جہاں اسلامی وحدت، شان وشوکت اور قوت وسطوت کا مرکز ہے، وہیں کعبہ مشرفہ رب العالمین کے جاہ وجلال، یکتائی وکبریائی، عظمت و عزت، رحمت وشفقت اور فضل وکرم کا مظہر ہے۔زادھما اللّٰہ شرفاً وعظماً.

کعبہ محترم! بارالٰہا! راقم کی زبان پر معاصی پر یہ کس کا نام آیا کہ نطق نے بوسے میری زبان کے لیے۔

کعبہ مقدس وہی متبرک ومعظم خانہ خدا ہے جس سے ساری کائنات کا وجود اور اس کا قیام و بقا مربوط ہے۔

اسی حرم مکرم سے دنیائے فانی کا نظام و انتظام اور امن وامان وابستہ ہے۔

رب کعبہ کا ارشاد ہے: (ترجمہ) ''خدا تعالیٰ نے کعبے کے مقدس گھر کو انسانوں کے باقی رہنے کا مدار ٹھہرایا ہے''۔[سورۃ المائدہ:۹۷]

یہی اسلامیان عالم کا کعبہ مقصود ہے۔ یہ بے جسم اور بے نشان والے حی وقیوم، غیب کے ستر پردوں میں مستور علیم وخبیر، رگ جاں سے زیادہ قریب سمیع وبصیر، آنکھ کی ہر جنبش اور دل کے ہر پوشیدہ خیال سے باخبر پروردگار عالم کی عظمت و رفعت، قادر مطلق کے جاہ وجلال، اس کی رحیمی و کریمی، اس کی غفاری وستاری، اس کی خلاقی و رزاقی، اس کی یکتائی وکبریائی اور اس کی دیگر اعلیٰ صفات کا مظہر ہے۔

یہ حریم قدس وہی نورانی بیت یزدانی ہے جہاں ہر برس خدائے رحمٰن ورحیم کے باتوفیق اہل ثروت بندے لاکھوں کی تعداد میں حج کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ یہ ضیوف الرحمٰن اس کے دامن میں پہنچ کر اپنے ہمہ داں وہمہ توانا رب کریم ارحم الراحمین کو بہ یک زبان وقلب پکارتے ہیں۔اپنی حاضری کا اعلان واقرار کرتے ہیں۔ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔اپنی لغزشوں پر شرم سار ہوتے ہیں۔اپنی خطاؤں پر ندامت کا اظہار کرتے ہیں۔رحمٰن دنیا ورحیم آخرت سے اپنی سیہ کاریوں کی معافی مانگتے ہیں۔اس عالم کے ستار اور اس عالم کے غفار کو اس کی بے پایاں رحمت و رافت، شفقت ومحبت اور عفو ودرگزر کا واسطہ دے دے کر توبہ وانابت کرتے ہیں۔ دیوانہ وار طواف کرتے ہیں۔ ملتزم سے لپٹتے ہیں، حجر اسود کو بوسہ دیتے ہیں۔ مقام ابراہیم پر نماز پڑھتے ہیں۔ میزاب رحمت کے نیچے دعائیں مانگتے ہیں۔ در و دیوار کو چومتے ہیں، ان سے چمٹتے ہیں۔آنکھیں ملتے ہیں۔ مطاف میں قیام وقعود اور رکوع وسجود کرتے ہیں۔صفا ومروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔ صحن حرم میں روتے، بلکتے اور گڑگڑاتے ہیں۔توحید کے کلموں، تلبیے کے زمزموں اور اقرار رسالت کے نعروں سے اپنی زبان تر رکھتے ہیں۔ حج کے بعد اپنی باقی زندگیوں کو اپنے خالق ومالک کی مرضیات کے مطابق گزارنے کا وعدہ واقرار کرتے ہیں۔ گوکہ یہ تمام حجاج کرام رنگ، نسل، زبان، علاقے، ثقافت اور تہذیب میں یک ساں نہیں ہوتے ہیں لیکن وہ فاطر السماوات والارض کے اس البیلے اور پیارے گھر میں یک زبان، یک لباس، یک جہت اور یک رنگ ہوتے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ رب کعبہ نے اپنے پاک وپاکیزہ گھر کو اپنے بندوں کے لیے مقام رجوع اور جائے امن قرار دیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: (ترجمہ) ''اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے خانہ (کعبہ) کو لوگوں کے لیے ایک مقام رجوع اور مقام امن مقرر کیا''۔

[سورۃ البقرہ:۱۲۵]

مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادیؒ رقم طراز ہیں:

''البیت سے متفقہ طور پر مراد بیت الحرام یا حرم کعبہ ہے۔شہر مکہ معظّمہ کے اندر کی یہ عمارت روئے زمین پر خدائے واحد کی عبادت کا قدیم ترین مکان ہے---

مسیحیت کو کعبے کی تقدیس وبرکت کے ساتھ ساتھ کعبے کی یہ قدامت بھی نہایت شاق ہے لیکن انکار قدامت پر کوئی دلیل ہر ممکن کوشش کے بعد آج تک قائم نہیں ہوسکی ہے۔ بلکہ انیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں انگریز مصنف کو لکھنا پڑا: ''یہ وہ معبد ہے جس کی قدامت عہد تاریخ سے

پرے ہے''۔[محمد اینڈ محمد نزم، ص:۱۶۶]

پھر آگے مشہور وقدیم رومی مورخ ڈایوڈورس سکولس (Diodorus Siculus) جس کا زمانہ خود حضرت مسیحؑ سے ایک صدی قبل کا ہے، کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس وقت بھی یہ معبد قدیم ترین تھا اور ساری نسل عرب کا نہایت مقدس مرجع تھا۔(ص:۱۶۶)''

[ص:۲۴۰تفسیر ماجدی، جلد اول]

حرم کعبہ کی تاریخ بنی نوع انساں کی تاریخ ہے۔ دنیا کے بت کدے میں خدائے واحد لاشریک لہ کی عبادت کے لیے یہی مقدس گھر اولین عبادت خانے کے طور پر تعمیر ہوا۔

مالک کعبہ کا ارشاد ہے: (ترجمہ) ''بے شک سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لیے وضع کیا گیا وہ وہ ہے جو بکہ (مکہ مکرمہ) میں ہے (سب کے لیے) برکت والا اور سارے جہاں کے لیے راہ نما ہے''۔[سورہ آل عمران:۹۶]

حرم محترم کی تعمیر اس وقت ہوئی جب دنیا کی تعمیر ہوئی۔ جس وقت (خاکم بدہن) یہ مٹے گا، کارخانہ حیات ونظام کائنات بھی مٹ جائے گا۔

خانہ کعبہ کا تذکرہ مولانا دریابادیؒ کے وجد آگیں الفاظ میں:

''اللہ اکبر! یہ کون سا گھر سامنے ہے؟ نگاہیں کس گھر کی دیواروں کی بلائیں لے رہی ہیں؟ یہی تو وہ گھر ہے جس کی بابت کہا گیا ہے ''دنیا کے بت کدہ میں پہلا وہ گھر خدا کا'' روئے زمین پر سب سے پہلا عبادت خانہ! صدی دوصدی کی تعمیر نہیں، دو ہزار چار ہزار برس کی عمارت نہیں، دنیا کا سب سے پہلا عبادت خانہ! کون تاریخ اس وقت کا پتہ بتا سکتی ہے؟ کس نسل انسانی کا حافظہ وہ زمانہ یاد رکھ سکتا ہے؟ جس گھر کی بنیادیں خود آدمؑ نے اپنے ہاتھ سے رکھی ہوں، بنی آدم میں کون اس وقت کی یاد اپنے حافظے میں رکھ سکتا ہے؟

اللہ اللہ! اس طویل اور بے حساب مدت میں، اس ناقابل پیمایش عرصے میں کتنے عبادت خانے بنے اور بگڑے، کتنے مندر تعمیر ہوئے اور کھدے، کتنے گرجے آباد ہوئے اور اجڑے، کیسے کیسے انقلابات زمین نے دیکھے اور آسمان نے دکھلائے۔ بلندیاں پست ہوئیں اور پستیاں بلند ہوئیں۔ بابل مٹا، مصر مٹا، چین مٹا، ہندوستان مٹا، ایران مٹا، یونان مٹا، رومہ مٹا، خدا معلوم کتنے ابھرے اور ابھر کر مٹے، کتنے بڑھے اور بڑھ کر گھٹے، پر ایک عرب کے ریگستان میں خاک اور ریت کے سمندر میں، چٹانوں اور پہاڑوں کے وسط میں، وادیوں اور گھاٹیوں کے درمیان یہ سیاہ چوکور گھر، جسے نہ کسی انجینئر نے بنایا، نہ کسی مہندس نے، جوں کا توں کھڑا ہوا ہے! صدہا طوفان، ہزارہا انقلابات، بے شمار زلزلے آئے اور گزر گئے اور اس پاک اور پیارے گھر کو نہ کوئی ابرہہ مٹا سکا، نہ کوئی زارنکولس اور نہ کوئی گلیڈ اسٹن! جو اسے مٹانے کو اٹھا وہ خود مٹ گیا اور اللہ کے گھر میں اللہ کی جو عبادت آدمؑ اور حوا نے کی تھی وہی آج آدمؑ کے فرزند اور حوا کی بیٹیاں کر رہی ہیں!''

[سفر حجاز، باب۲۴، ص:۲۸۷-۲۸۸]

صدق نگار خامہ ماجدی کیف ووجد کے موتی مزید رولتا ہے:

".....رب السمٰوٰت والارض کا گھر، بیت اللہ! روئے زمین کے سارے طول وعرض میں کوئی اور گھر بھی، کہیں اور کبھی اس نام سے پکارا گیا؟ دیویوں کے مٹھ کتنے بنائے گئے، دیوتاؤں کے مندر کتنے سجائے گئے، بتوں کی پوجا کے لیے کیسے کیسے کلس دار شوالے سنوارے گئے اور آج بیسویں صدی کے دور جاہلیۃ الاخریٰ میں آرٹ اور سائنس کی دیویوں اور تہذیب وتمدن کے دیوتاؤں کی پوجا کے لیے، کالجوں اور یونی ورسٹیوں اور آرٹ اکیڈیمیوں کے نام سے، کتنے بت کدوں اور صنم خانوں کی اونچی اونچی تعمیریں کہاں اور کس حصہ زمین میں نہیں ہو رہی ہیں؟ بے شمار بت ہیں اور بے شمار ہی بت کدے، لیکن وہ جو ایک اکیلا ہے، واحد اور احد ہے، یکتا اور لاشریک لہ ہے---ذرا شان توحید کا پرتو دیکھنا---اس کا مکان بھی اس عالم آب وگل میں صرف ایک ہے۔ تاریخ کے اوراق الٹ ڈالو، جغرافیہ کی مدد سے اس وسیع وفراخ سطح زمین کا چپہ چپہ چھان ڈالو، بیت اللہ کے نام کی صرف یہی ایک عمارت ملے گی! اور پھر گھر بھی کیسا گھر؟ کس صفت کا گھر؟ "ھدی للعالمین" ساری دنیا کے لیے ہدایت رکھنے والا، ہر قوم، ہر ملک، ہر طبقے، ہر گروہ کو درس ہدایت دینے والا! اس کے انوار، اس کے برکات، اس کے فیوض اور اس کی ہدایات، کسی ایک زمانے کے لیے، کسی ایک ملک کے لیے مخصوص نہیں، زمان کے قیود اور مکان کے حدود سے آزاد، جب اور جہاں جس کا جی چاہے اس سے فیض حاصل کرے''۔

[سفر حجاز، باب۲۴، ص:۲۸۹-۲۹۰]

رب کعبہ سے دعا ہے کہ وہ اپنے مقدس حرم کے مجد وشرف، تعظیم وتقدیس، رونق اور آبادی میں بیش از بیش اضافہ فرمائے۔ ہر قسم کے شر وفساد سے اس کی صیانت وحفاظت فرمائے۔ اسلامیانِ عالم کو اس کی نگہ بانی وپاس بانی کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆☆☆

یادوں کے چراغ

میرے مشفق و مربی استاذ گرامی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

عمر محبوب ندوی (ممبئی)

غالباً ۱۹۸۲ء کی بات ہے جب راقم دارالعلوم دھارنی ضلع امراوتی مہاراشٹر میں شعبۂ حفظ میں زیر تعلیم تھا۔ اس وقت جو بچے عالیہ اولیٰ شریعہ کا امتحان دینے ندوہ جاتے تھے تو آنے کے بعد وہ ندوہ کی کہانی ضرور سناتے تھے۔ اس کہانی میں وہ جہاں ندوہ کی تعلیم اور حسنِ انتظام پر تبصرہ کرتے، وہیں وہ اس بات کا بھی ذکر کرتے کہ ہم نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی زبان پر دو نام بہت سنے، ایک مولانا رابع حسنی ندوی اور دوسرے مولانا واضح رشید ندوی کا (رحمہما اللہ تعالیٰ)، ہم اس وقت بہت چھوٹے تھے اور بس ندوہ کی کہانی سن کر ہی محظوظ ہوتے تھے۔ پھر وہ دن بھی آئے کہ ہم نے حفظ کی تعلیم مکمل کی اور درجہ عالمیت میں ہمارا داخلہ ہوا، ہماری دلی تمنا تھی کہ ہم عالمیت وفضیلت ندوہ سے کریں۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا جب ہم ۱۹۹۱ء میں باقاعدہ ندوہ میں داخل ہوگئے، اب ہمیں استاذ گرامی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہم عالیہ اولیٰ میں داخل ہوئے اور پھر دھیرے دھیرے عالیہ رابعہ (عالمیت) تک پہنچ گئے۔ اور اب ہم براہِ راست حضرت مولانا رابع حسنیؒ کے شاگرد بن گئے تھے۔ کیوں کے اس درجہ میں مولانا اپنی مشہور کتاب "الأدب العربی بین عرض ونقد" پڑھاتے تھے، غالباً آخری گھنٹہ ہوتا تھا اور مولانا عباسیہ ہال میں عالیہ رابعہ کے تمام سیکشن کے بچوں کو ایک ساتھ پڑھاتے تھے، پڑھاتے کیا تھے، رس گھول کر پلاتے تھے۔ مولانا ایک ماہر ادیب تھے؛ لیکن آپ اتنی آسان عربی زبان میں درس دیتے تھے کہ اگر کوئی طالب علم اس کا ترجمہ کرنا چاہے تو فوراً کرسکتا تھا۔ ہم نے حضرت مولانا رابع حسنیؒ کے اہتمام کا دور بھی دیکھا ہے۔ مولانا کو ندوہ کے طلباء کی بڑی فکر تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ندوہ کہ طلباء عربی زبان و ادب میں مہارت تامہ حاصل کرلیں اور قرآن و حدیث کی خدمت کریں۔

ندوہ میں جو طلبہ جماعت تبلیغ سے منسلک ہوتے تو وہ ہفتہ میں ایک بار کسی استاذ کو ضرور دعوت دیتے کہ وہ طلبہ سے خطاب کریں۔ کبھی کبھی حضرت مولانا رابع حسنیؒ کا بھی خطاب ہوتا تھا۔ مولانا دعوت وتبلیغ کے ساتھ طلبہ کو تعلیم کی طرف بھی متوجہ کرتے تھے۔ بیان کے دوران وہ اپنی مثال بھی پیش فرما دیا کرتے تھے، ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ ہمارے ماموں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کو پڑھائی کے تعلق سے بڑی بہت فکر رہتی تھی۔ جب ندوہ کی مسجد میں کوئی بیان ہوتا تو کہتے اس کا فوراً عربی میں ترجمہ کرو، ہم حکم کی تعمیل کرتے، جب اس ترجمہ کو ماموں جان کی خدمت میں پیش کرتے تو ماموں جان اغلاط کی تصحیح فرماتے اور اگر ہم دوبارہ وہی غلطی کرتے تو ہمیں باقاعدہ ڈانٹ پلائی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ پڑھائی میں خوب محنت کرو اور کتاب کھول کر جب مطالعہ کرو تو اس سبق کو اچھی طرح حل کرنے کی کوشش کرو، اگر سمجھ میں نہ آئے تو آستین چڑھا لو اور اس سے گویا ایک طرح کی کشتی لڑو کہ یہ عبارت یا یہ مسئلہ کیسے حل نہیں ہوتا؟ آج تو اسے حل کرکے ہی دم لوں گا جب تک حل نہ ہو میں اسے چھوڑوں گا نہیں، پھر دیکھو کیسے دھیرے دھیرے آپ کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ ایک اور موقع پر فرمایا کہ جب ہمیں ندوہ کا ادیب بنایا گیا تو ہمارے پیروں سے جیسے زمین کھسک گئی ہو، ہم نے سوچا یا، اللہ اتنے بڑے ادارہ کا ہمیں ادیب بنایا گیا تو ہماری لاج رکھنا، البتہ ہم نے ہمت نہیں ہاری بلکہ خوب محنت کی اور رات دن ایک کیا اور اپنے آپ کو اس قابل بنایا کہ جو ذمہ داری ہمیں دی گئی ہے ہم اس کا صحیح حق ادا کریں، یہ سب محنت سے ہوا، محنت کرنے والوں کی دنیا میں قدر ہوتی ہے۔

حضرت مولانا رابع حسنی رحمہ اللہ، حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے دست راست تھے، اکثر و بیشتر سفر وحضر میں آپ ہی ساتھ رہتے تھے۔ مولانا علی میاں ندوی کے انتقال کے بعد آپ ٹوٹ سے گئے تھے، لیکن پھر بھی راز و نیاز کی باتیں کرنے والا ایک بھائی مولانا واضح رشید حسنی رحمہ اللہ کی شکل میں موجود تھا، چند سالوں پہلے جب بھائی کا بھی انتقال ہوگیا تو گویا آپ بالکل اکیلے ہوگئے تھے حتی کہ آپ نے اسفار بھی بالکل ترک کردیا تھا، ایک ساتھی نے بتایا کہ مولانا واضح صاحب کے انتقال کے بعد کسی نے کہا کہ حضرت! کچھ دنوں کے لیے ممبئی ہوآئیں کہ طبیعت ذرا بہل جائے، تو فرمایا کہ واضح کے بغیر اب سفر اچھا نہیں لگتا۔

کتنی عظیم شخصیت تھی جو ہمارے درمیان سے اٹھ گئی، اللہ ہمارے حضرت کی مغفرت فرمائے، درجات بلند فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆☆☆

فلاحِ دارین

حیاتِ فانی اور حیاتِ دائمی

عبید الرحمٰن ندوی

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کی اہم شق رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان کو رضائے الٰہی کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے اور اسی کی خاطر ایک تقویٰ پر مبنی زندگی گزارنی چاہیے۔ اور یہی اس کی زندگی کا اہم مقصد ہونا چاہیے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: ''جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تا کہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے، اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی''۔ [الملک: ۲] مزید ارشاد ہے: ''اور ہم ضرور تمہیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان ومال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو صبر کریں انہیں خوش خبری دے دو''۔ [البقرہ: ۱۵۵] اسلام کے مطابق حقیقی زندگی کا آغاز موت کے بعد ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر مسلمان کو اخروی زندگی کی تیاری کرنے کے لیے بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔

یہ دنیا عبوری ہے۔ حقیقی معنوں میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ آخرت کا تصور دن بہ دن مسلمانوں کے دلوں سے محو ہوتا جا رہا ہے۔ مسلم نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد روزانہ مرتد ہو رہی ہے۔ ارتداد کی لہر بڑھتی جا رہی ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ کا فرمان ہے: ''الجنة فی صدری'' (جنت میرے دل میں ہے)۔ اس وقت کی یہ ضرورت ہے کہ ان کی فکر اور اصول کی تجدید کی جائے۔ اگر کوئی شخص اس اعتقاد کے ساتھ زندگی گزارے کہ جنت اس کے دل میں ہے تو کوئی مضر اور اسلام مخالف عمل سرزد نہ ہو۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسلام میں ہر عمل عبادت اور پرستش تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر مسلمان کو اپنی زندگی قرآن اور سنت کے مطابق گزارنی چاہیے۔ اسلام پورے عالم میں امن اور بھائی چارہ کو فروغ دینے کے لیے آیا ہے؛ لیکن اب اسلام کو پورے عالم کے لیے خطرے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے، علاوہ ازیں اسلام اور اس کے متبعین کو بدنام کرنے کے لیے ایک بین الاقوامی سازش رچی جا رہی ہے۔ اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے کوئی کسر باقی نہیں رکھی جا رہی ہے۔ یہ رجحانات امریکہ میں ۹/۱۱ واقعہ کے بعد بڑھے ہیں۔ اسرائیل کے ہاتھوں فلسطینیوں کی موجودہ نسل کشی بھی اسلام کے خلاف بین الاقوامی سازش کا حصہ ہے۔ اس کے برعکس، فلسفۂ حیات لذت اندوزی خورد ونوش اور مسرور رہنے کا نام ہے۔ اس فلسفۂ حیات کی داغ بیل یونانی فلسفی اپی کورس نے ڈالی تھی۔ اس کے مطابق زندگی کا اصل مقصد خورد ونوش اور مسرور رہنا ہے کیونکہ کل تو ہمیں مرجانا ہے۔ آج تقریباً پورا عالم فلسفۂ حیات لذت اندوزی کی اقتداء کر رہا ہے۔ بدقسمتی کی بات تو یہ ہے کہ آج مسلمانوں کی بھی بڑی تعداد اس فلسفۂ حیات کی اتباع کرتی ہے۔

مسلمانوں کو اسلامی فلسفۂ حیات سے واقف ہونا چاہیے۔ اسلامی فلسفۂ حیات رضائے الٰہی حاصل کر کے ایک متقی اور صالح زندگی گزارنا ہے۔ انہیں اس بات کی بھی تلقین کی جانی چاہیے کہ وہ شریعتِ اسلامی کے حدود سے متجاوز نہ ہوں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے: ''جو شخص بھی نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے''۔ [النحل: ۹۷]

مذکور بالا آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ فرماتے ہیں: ''اس آیت میں اللہ ایسی خوش خبری کا اعلان کرتا ہے، اس بات کی منادی کرتے ہوئے کہ جو کوئی نیک عمل کرے گا اسے ایک کامیاب زندگی سے سرفراز کیا جائے گا۔ اللہ کا وعدہ برتر ہے اور اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ یقین دلایا ہے کہ وہ یقینی طور پر ایسے مرد اور عورتوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں انہیں ایک کامیاب زندگی سے سرفراز فرمائے گا۔ جیسا کہ ہم نے پہلے مشاہدہ کیا، پوری نوعِ انسانی ایک خوشحال زندگی کے تحفظ کے لیے دن رات محنت کرتی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی ان خطوط پر گزارتا ہے تو اللہ کا شادمانی اور کامیابی کا وعدہ ہے۔ اس حقیقت کی متعدد مثالیں گواہ ہیں''۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہمیں اللہ پر مکمل بھروسہ کرنا چاہیے اور ہمیشہ خشیتِ الٰہی کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور ہر عمل اس کی خاطر کرنا چاہیے۔ اور آخرت کا تصور رکھتے ہوئے، ہمیں اس روئے زمین پر ایک اچھی زندگی گزارنی چاہیے۔ علاوہ ازیں سماجی حیوان

ہونے کے ناطے ہمیں دوسروں کو فلسفۂ حیات لذت اندوزی سے نجات دلانے کے لیے کلی طور پر اسلامی فلسفۂ حیات کی تقلید کی ترغیب دینی چاہیے تاکہ موجودہ ارتداد کا سیلاب آسانی سے روک سکیں۔ جیسا کہ قرآن مجید کا ارشاد ہے: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو''۔ [آل عمران:۱۰۲] ''اے ایمان لانے والو، اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کیا کرو۔ اللہ تمہارے اعمال درست کردے گا اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی''۔ [الاحزاب:۷۰-۷۱]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، جس پر نہایت تندخو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم انہیں دیا جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں''۔ [التحریم:۶]

آج مقامِ افسوس یہ ہے کہ ہم حُب عاجلہ کا شکار ہوگئے ہیں۔ حُب عاجلہ کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کی زندگی اور اس کی نعمتوں کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی اور اس کی لذتوں کو ترجیح دینا۔ قرآن کریم ایسے لوگوں کا ذکر یوں کرتا ہے: ''یہ لوگ عاجلہ کو پسند کرتے ہیں اور اپنے آگے ایک بھاری دن کو نظر انداز کررہے ہیں''۔ [الدہر:۲۷]

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اصل زندگی کی تیاری کریں اور آخرت کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہے۔ آج آخرت کا تصور ہمارے نوجوانوں کے دلوں سے عنقا ہوتا جارہا ہے۔ حُب عاجلہ یعنی دنیا کی محبت ان پر اس قدر غالب ہے کہ جنت اور جہنم کا تصور آخرت میں حساب وکتاب کا تصور بھی ان کے دلوں سے ختم ہوتا جارہا ہے۔ آج فرق کرنا مشکل ہوگیا ہے کہ کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم۔

لہٰذا اہم نقطہ یہ ہے کہ ہمیں بچوں کی اسلامی تعلیم واخلاقی تربیت کا نظم کرنا چاہیے۔ مذہبی امور میں ان کی رہنمائی کرنی چاہیے تاکہ انہیں جہنم کی آگ سے بچایا جاسکے۔ ایسے انتظامات انہیں اللہ کے غضب سے محفوظ رکھیں گے اور ہدایتِ الٰہیہ کے مطابق زندگی گزارنے میں انہیں مدد ملے گی۔ اس طور پر وہ ایک قابلِ رشک زندگی گزاریں گے اور آنے والی زندگی میں انہیں نجات اور کامیابی حاصل ہوگی۔

☆☆☆☆☆

سید احمد شہید اکیڈمیؒ رائے بریلی کی پیش کش

تذکرہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی

بقلم: مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

شیخ الاسلامؒ کی حیات وخدمات، قوم وملک کے لیے ان کے مجاہدانہ کارنامے، امت کی دینی وسیاسی رہنمائی اور ان کے علمی ورحانی مقام ومرتبہ کا ایمان افروز تذکرہ۔

صفحات:160 قیمت: Rs.130

ایک عشرہ سئی کی وادی میں

بقلم: پروفیسر رشید کوثر فاروقی

معروف ادیب ونقاد پروفیسر رشید کوثر فاروقی کی زندگی کے ان دس دنوں کی داستاں جو انھوں نے دائرہ شاہ علم اللہ (تکیہ کلاں) میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی صحبت میں گذارے تھے، دس دن کی محدود رفاقت، مفکر اسلام کے شب وروز کے مشاہدے اور ذاتی تجربات واحساسات کا ایک حسین ودلکش بیانیہ! عام قارئین کے لیے علمی وادبی سوغات! صفحات:120 قیمت:Rs.100

سید احمد شہید اکیڈمی دارعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی
رابطہ: 9919331295

تبصرہ وتعارف

’دولتِ عثمانیہ اور ترکی کی تاریخ‘

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

۱۳ مئی کی شام کو مہمان خانہ ندوۃ العلماء کے سامنے سبزہ زار پر اِک باوقار علمی اجلاس منعقد کیا گیا، جس کا عنوان استادِ گرامی قدر مولانا عتیق احمد بستوی مدظلہ کی قابلِ قدر تصنیف ’’دولتِ عثمانیہ اور ترکی کی تاریخ - تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ‘‘ کا رسمِ اجراء تھا۔ اس مہتم بالشان اجلاس میں اربابِ علم واصحابِ قلم اور اساتذۂ ندوۃ العلماء کے ساتھ طلبۂ ندوہ کی اک بڑی تعداد شریک تھی، جس کی نظامت کے فرائض سلمان نسیم ندوی صاحب نے انجام دیے۔

یہ اِک خوبصورت شام تھی، جس میں اس اہم موضوع پر شائع ہونے والی کتاب کے حوالہ سے جو گفتگو ہوئی، وہ متانت ومعنویت سے بھرپور اور چشم کشا ومعلومات افزا تھی۔ اس موقع پر صاحبِ کتاب کے علاوہ ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی، ناظرِ عام ندوۃ العلماء مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی، استادِ گرامی مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی، نائب مدیر تعمیرِ حیات مولانا عمیر الصدیق دریابادی ندوی، معروف خطیب و دانشور جناب مسعود الحسن عثمانی (دینی تعلیمی کونسل) کے وقیع خطابات ہوئے، جس میں کتاب کی اہمیت اور محاسن پر روشنی ڈالی گئی۔

استادِ گرامی قدر کی اس تالیف کا چرچا عرصہ سے سنتے آئے تھے، اور اس کے منظرِ عام پر کا اصاغر واکابر سبھی کو اشتیاق تھا۔ دراصل یہ کام مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایما ومنشا پر شروع کیا گیا تھا، اور حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ومولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمہما اللہ کا اصرار وتقاضا اس کی تالیف میں شاملِ حال رہا۔

’’دولتِ عثمانیہ اور ترکی کی تاریخ‘‘ تقریباً پانچ دہائیوں کی عرق ریزی، تلاش وجستجو اور مطالعہ وکتب بینی کا ثمرہ ہے، جس کو مولانا مدظلہ اعلیٰ ذوق تحقیق اور معتدل وسنجیدہ اسلوب تحریر نے اعتبار واعتماد کی سند عطا کی ہے۔

عصرِ حاضر کے دانشورانِ ملت اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ دراصل یہ زبوں حالی، کسمپرسی، انارکی اور احساسِ بے چارگی جس سے امتِ اسلامیہ آج دوچار ہے، سقوطِ سلطنتِ عثمانیہ کا شاخسانہ ہے، جس کی سازش بڑی باریک بینی اور عیاری سے رچی گئی، اور ہمیشہ کی طرح امت ہی کے مفاد پرستوں اور ابن الوقتی کے ماروں نے اس میں حصہ لیا، اور اس کو کامیاب بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

یہ بھی اک مسلم حقیقت ہے کہ اعداءِ اسلام یہود ونصاریٰ کا وطیرہ رہا ہے کہ ان کی سازش کا دائرہ کار کسی حکومت کا تختہ پلٹ دینے یا کسی قوم کا اتحاد پارہ پارہ کردینے یا کسی بڑی شخصیت کو ہلاک کردینے تک محدود نہیں رہتا؛ بلکہ اصل کام وہ واقعہ کے بعد انجام دیتے ہیں، اور وہ کام ہے مد مقابل کی شبیہ بگاڑنے کا، کل واقعاتی سلسلہ میں سیاہ کو سفید وسفید کو سیاہ کردینے کا، اور تاریخ کے چہرہ کو پورے طور پر مسخ کردینے کا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مدّ مقابل کا نقصان یا حادثہ کا اثر نہ صرف یہ کہ لامتناہی ہوجاتا ہے؛ بلکہ اس کے تدارک اور تلافی کا امکان بھی دور دور تک باقی نہیں رہتا؛ ظاہر ہے جب اصل حقائق ہی درپردہ رہ جائیں اور حقیق شواہد نگاہوں سے اوجھل ہوجائیں تو مستقبل میں ان سے درسِ عبرت کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے؟ اور آئندہ کے لیے کوئی لائحۂ عمل کیسے طے کیا جاسکتا ہے۔

یہود کا یہ وطیرہ تاریخی ہے؛ انھوں نے مقدس پیغمبروں اور اللہ کے فرستادوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا، ابتدائے اسلام میں جنگ جمل وصفین سے لے کر شہادتِ حسینؓ تک جو افواہوں کی گرم بازاری کی گئی، اور دسیسہ کاریوں کے ذریعہ اہلِ اسلام کو باہم دست گریباں کیا گیا، پھر اس کے بعد ایسی روایات اور افترا پردازیوں کو عام کیا گیا کہ آج تک نفس پرست اعدائے اسلام کے آلۂ کار کے لیے وہ سامان فتنہ انگیزی بنی ہوئی ہیں، سادہ لوح مسلمان ان کے جال میں پھنستے رہتے ہیں، اور اہلِ حق کی بڑی طاقت اور قوتِ عمل ان واقعات کے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ الگ کرنے میں لگی ہوئی ہے۔

سقوطِ سلطنتِ عثمانیہ میں اور اس کے بعد بھی یہی Trick اختیار کی گئی۔ پہلے قومی، نسلی وعلاقائی تعصب کے جذبات کو فروغ دیا گیا، اس کے بل بوتہ پر اتحادِ امت کو پارہ پارہ کیا گیا، اسی پر سقوط کی بنیاد پڑی، اور سقوط کے معاً بعد دشمن اپنے کام پر لگ گیا، اور مدّ مقابل یعنی سلطنت عثمانیہ کے سربرآوردہ حکمرانوں، خاص طور پر حاکم خاندان کے اہم افراد اور بالاخص سلطان عبدالحمید رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کو مجروح کرنے کی کوششیں تیز تر کردی گئیں، اور

ایسا مواد تیار کر دیا گیا کہ ایک معتدل و منصف مزاج مسلم مؤرخ بھی اس سانحہ کی تاریخ لکھے تو اہلِ سلطنت کو ہی اس ذمہ دار ٹھہرائے۔

اس کی مثال قاضی عدیل عباسی مرحوم کی معرکۃ الآراء تصنیف ''تحریکِ خلافت'' سے دی جاسکتی ہے، جو اپنی ذات میں اسلام پرست اور مداح خلافت ہونے اور اپنی تحقیق میں صداقت و ایمانداری کے با وجود کئی موقعوں پر یوروپین مؤرخین کے داؤ کا شکار ہو گئے۔

قاضی عدیل عباسی مرحوم کی اسی کتاب ''تحریکِ خلافت'' کو، جس کی بڑی شہرت ہوئی اور اس کے معیارِ تحقیق کی قدر بھی کی گئی' اگر اس کتاب کا بھی شانِ نزول نہ قرار دیا جاسکتا ہو تا ہم اس کا بڑا محرک ضرور قرار دیا جاسکتا ہے؛ مصنف نے ان کی کتاب کے بعض اہم مندرجات پر محققانہ نقد کیا جو ''الفرقان'' میں اس وقت شائع ہوا۔ اسی کے بعد مفکرِ اسلام رحمۃ اللہ علیہ انھیں اس موضوع پر باضابطہ قلم اٹھانے اور با قاعدہ پوری تاریخ مرتب کرنے کی نہ صرف یہ کہ دعوت دی؛ بلکہ ان کو اس کام کے لیے ندوہ آنے کی دعوت دی، جو قبول کر لی گئی، اور بعد میں ان کے ندوہ میں تقرر کا ذریعہ بھی بنی۔

صاحبِ کتاب کا تعلق اس موضوع سے طالب علمی کے دور سے رہا؛ انھوں نے ۱۹۶۷ء میں مدرسہ عربیہ نور العلوم، بہرائچ میں داخلہ لیا، جہاں کی لائبریری میں میں ندوۃ المصنّفین دہلی، دار المصنّفین اعظم گڑھ کی کتابیں نیز وقت کے معروف و مستند ترین تحقیقی اردو مجلّات 'الفرقان'، 'البرہان'، اور 'معارف' وغیرہ کی فائلوں کے مطالعہ نے ان کو موضوع سے روشناس کرایا، اور شوق مطالعہ کو مہمیز دیا۔

قاضی صاحب کی کتاب پر تبصرہ سے قبل بھی مولانا موصوف کئی مضامین تاریخ خلافتِ عثمانیہ کے حوالہ سے قلم بند کر چکے تھے، جو الفرقان میں شائع بھی ہو چکے تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ستر کی دہائی میں ہی مصنف اس میدان میں کافی آگے نکل چکے تھے، اور اسی بنا پر وقت کی دو بڑی شخصیتوں مفکرِ اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مناظرِ اسلام مولانا منظور نعمانی رحمہما اللہ کو اپنے ذوقِ تاریخ و تحقیق اور اسلوبِ تحریر سے متاثر کر چکے تھے۔

گرچہ مفکرِ اسلام رحمۃ اللہ علیہ کو اس کتاب کے منظرِ عام پر آنے کا شدت سے انتظار و تقاضا تھا؛ لیکن اللہ کی مرضی.....، اور دیر آید درست آید کے مصداق تاخیر بھی اس تالیف کی وقعت میں اضافہ کا باعث بنی؛ کیونکہ مصنف کو اس دوران جدید سے جدید تر تحقیقات و مطبوعات کے حصول اور مطالعہ کا موقع ملا، اور انھوں نے ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ انھیں اس بیچ سلطان عبدالحمید مرحوم کی دو ڈائریوں کا عربی ترجمہ اور اس دور کے چشمِ دید گواہ عظیم قلم کار و محقق ڈاکٹر احسان دمشقی کے وہ ضمیمے بھی جو "تاریخ الدولة العلية العثمانية" میں شامل کیے گئے' میسر آئے، جن کو انھوں نے اردو قالب میں ڈھالا اور اردو داں طبقہ کے لیے قابلِ مطالعہ بنایا۔

گرچہ سلطنتِ عثمانیہ اور اس کے سقوط کی تاریخ پر عربی میں کئی اہم اور وقیع کتابیں آچکی ہیں، مذکورہ بالا کتاب ان میں خاص اہمیت رکھتی ہے، اور اردو میں بھی دار المصنّفین اعظم گڑھ سے ڈاکٹر محمد عزیر کی کتاب ''دولتِ عثمانیہ'' دو جلدوں میں عرصہ ہوا' شائع ہو چکی ہے، اور مصنف کے ابتدائی دور کے مطالعہ میں شامل رہی ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے فاضل استاد ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی اور مطہرہ کی معروف شخصیت ثروت صولت صاحب نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اس کے باوجود اگر جامعیت و معنویت اور موضوع کے احاطہ کی بات کی جائے تو مولانا عتیق احمد بستوی کی یہ کتاب منفرد ہے، جو محض تاریخ نویسی کی نیت سے نہیں؛ بلکہ اس غرض سے تالیف کی گئی ہے کہ امت اپنے خلاف ہونے والی سازشوں کی اصل سے واقف ہو، دشمن کی عیاری و مکاری کو سمجھ سکے، غلط فہمیوں میں رہنے سے اب تک جو نقصان ہوا' اس کا تدارک کرے، ایک مضبوط لائحۂ عمل بنائے، اور اس پر کار بند ہو کر موجودہ صورتحال سے ابھرے۔

مصنف نے اس کتاب کا انتساب مفکرِ اسلام رحمۃ اللہ علیہ کی طرف کیا ہے۔ آغاز میں 'کلمۂ ناشر' مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی سکریٹری مجلس، مقدمہ فقیہ الامۃ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، پیش لفظ ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید بلال عبد الحی حسنی ندوی اور تقریظ مولانا عمیر الصدیق دریابادی ندوی نائب مدیر ''تعمیر حیات'' کی بصیرت افروز تحریروں سے عبارت ہے۔

یہ کتاب جو مجلد تین جلدوں میں ہے، ''مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام'' لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے؛ پہلی جلد ۴۸۶، دوسری جلد ۷۰۳ اور تیسری جلد ۵۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت بالترتیب ۴۵۰، ۵۵۰ اور ۵۰۰ درج ہے، ٹائٹل خوبصورت اور طباعت اعلیٰ ہے۔

رابطہ کے لیے:

۹۸۳۹۷۷۶۰۸۳

۰۵۲۲۲۷۴۱۵۳۹

☆☆☆☆☆

کاروانِ رفتگاں

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ

قرآن مجید کے رمز شناس، ادیب اور مصنف

محمد فرمان ندوی

استاذ محترم مولانا عبداللہ عباس ندویؒ ندوۃ العلماء کے ان ممتاز فرزندوں میں تھے، جنہوں نے قرآن کریم کا براہ راست مطالعہ کیا اور اس سے علم وادب، حکمت وموعظت اور دعوت وتبلیغ کے اصول اخذ کئے، مروجہ تفسیروں کا مراجعہ اور قدم قدم پر ان کی ضرورت واہمیت سے کسی صاحب علم کو انکار نہیں، لیکن تفسیروں کے واسطہ ہی سے قرآن فہمی تک پہنچنا اور اس کا اثر قبول کرنا قاعدۂ کلیہ نہیں۔ بحر قرآن کے بہتیرے ایسے پیراک ہیں جنہوں نے قرآن کریم کا براہِ راست مطالعہ کرکے نکات قرآنی کا استخراج کیا، مولانا عبداللہ عباس ندویؒ کے ساتھ توفیق الٰہی شامل حال رہی، ان کی علمی زندگی کا آغاز ہی کچھ ایسا ہوا کہ قرآن تادم واپسیں آپ کا اختصاصی موضوع رہا۔

مولانا علیہ الرحمہ نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے قرآن کا درس لیا، اور بقول آپ کے: حضرت مولانا کی تقریروں سے دل پسیج جایا کرتے تھے، اس وقت وہ زبانی تقریر کیا کرتے تھے اور طلبہ لکھ لیا کرتے تھے، ۱- ان دروس قرآن نے آپ کے دل کی قندیلیں روشن کیں، ۱۹۴۸ء میں ندوہ سے آپ مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ کے ادارہ تعلیمات اسلامی سے وابستہ ہوگئے، اور چند دنوں کے بعد رحیم آباد لکھنؤ میں مجوزہ المعہد الإسلامی کے لیے وہاں تشریف لے گئے، چونکہ ادارہ بعض اسباب کی بنا پر قائم نہیں ہوسکا، اس لیے حکیم شرافت حسین رحیم آبادیؒ کے ایماء پر بڑے زمینداروں کو قرآن کا ترجمہ پڑھانا شروع کیا، آپ دوران قیام رحیم آباد پنجوقتہ نمازوں کی امامت کے علاوہ نماز عشاء کے بعد درس قرآن دیا کرتے تھے خود ایک جگہ رقمطراز ہیں: ''یہاں کے لوگوں نے اسلامی شرافت واخلاق کا معاملہ کیا، بڑے، بوڑھے، جوان اور نوعمر سب مل کر میرا درس سنتے تھے''، ۲- اس درس قرآن کی برکت سے آپ نے پوری تفسیر خازن پڑھ ڈالی اور اللہ تعالیٰ نے بہت سے علمی نکتے بھی سلجھائے۔

درس قرآن میں مشکل مقامات کے حل کے لیے آپ نے مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے ملاقاتیں کیں اور مراسلت جاری رکھا، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی کثرت اسفار اور مولانا عبدالسلام ندویؒ کے جامعہ ملیہ منتقل ہونے کے بعد تفسیری مباحث میں جب مشکل در آئی تو آپ نے ایک عریضہ علامہ سید سلیمان ندوی کے نام ارسال فرمایا اور اپنی قوت تدبر سے حاصل کردہ فہم کی وضاحت فرمائی، سید صاحبؒ نے ملاحظہ فرما کر تصویب وتائید کی، مولانا موصوف فرماتے ہیں کہ: ''سید صاحبؒ کے تائیدی جملے نے میرے شوق تلاوت کو بڑھایا، اور دو رکعت شکرانہ پڑھ کر اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ! قرآن کے سمجھنے کے لیے میری زندگی لگادے۔ وہ سورۂ اعراف کی آیت ۳۵-۳۶ ہے، اس میں ''مستقر'' اور ''اسکن'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جنت میں قیام کے لیے ''اسکن'' کا لفظ وارد ہوا ہے، کیونکہ وہاں سکونت ہمیشہ کے لیے ہوگی، اور اس کے بعد والی آیت میں زمین پر اقامت ایک عارضی اور متعین ٹھکانہ ہے ''مستقر'' کا لفظ استعمال ہوا۔

مولاناؒ کے قرآن کریم سے فطری لگاؤ میں رفتہ رفتہ استحکام اور پختگی آرہی تھی، چنانچہ مولانا محمد ناظم ندوی کی تجویز اور مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کے ایماء پر جب ندوہ میں مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوا تو قرآن کا گھنٹہ آپ کے ذمہ کیا گیا، اس سلسلہ میں تفسیر بیضاوی، موضح القرآن شاہ عبدالقادر، ترجمۂ قرآن مولانا احمد علی لاہوری اور بیان القرآن حضرت مولانا تھانوی سے خوب استفادہ کیا، اس کی وضاحت حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء یوں کرتے ہیں:

''ان کے ذمہ ادب کے ساتھ تفسیر قرآن کا درس بھی تھا، اس طریقہ سے مولانا کا ادبی ذوق قرآن مجید کی بلاغت سے استفادہ کردہ ذوق سے مل کر دو آتشہ ہوگیا تھا''۔

عمر کی پیرانہ سالی اور ضعف بصارت وصحت کے باوجود بھی حضرت مولانا عبداللہ عباس ندویؒ دروسہائے قرآن کا اہتمام فرمایا کرتے تھے، آپ کی جملہ تصنیفات میں یہی قرآنی فکر گردش کرتی نظر آتی ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ آپ علمی

کاوشوں کا مرکزی موضوع قرآن ہے تو غلط نہ ہوگا، قرآنی آیات کا برمحل استعمال، صحیح تطبیق اور ان سے نتائج کا استخراج آپ کی فطرت ثانیہ تھی، آپ کو قرآن سے عشق کی حد تک محبت تھی، انتقال سے چند سال پہلے بعد نماز فجر ومغرب آپ کا درس قرآن ہوتا، مغرب کے بعد سورۂ فاتحہ اور بقرہ کی کچھ آیات زیر درس رہیں جبکہ فجر کے بعد سورۂ نحل تھی، بطور تمہید آپ کے نوک زبان سے یہ جملے نکلے کہ قرآن کے مخاطبین اولین چونکہ عرب تھے، اسی لیے ان کے یہاں کی ضرورت کا ذکر کیا گیا، چونکہ ان کے یہاں قحط اور پانی کی قلت کا شکوہ رہتا تھا، اسی لیے ترغیب وتشویق کی خاطر "جنات عدن "اور " تجری من تحتها الأنهـــار " کا تذکرہ کیا، تاکہ بروقت ان کی ضرورت کی تکمیل ہو سکے، عمومی جائزہ کے ساتھ آپ کا درس قرآن الفاظ قرآنی کی تحقیق وتدقیق پر بھی مشتمل ہوتا تھا، ایک بار فرمایا کہ عموماً مفسرین نے ''طاغوت'' کو شیطان کے مرادف قرار دیا ہے، لیکن دور حاضر کے مفسرین نے کہا ہے کہ ہر وہ طاقت جس کو اللہ کی طاقت کے مقابلہ میں پیش کیا جائے، ہر وہ طاقت جو اسلام کے خلاف آئے یعنی غیر حق کی طاقت۔

مولانا عبداللہ عباس ندویؒ نے زبان وبیان کے رموز واسرار کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن کی آیات کا ترجمہ کرنے میں احتیاط سے کام لیا ہے، عموماً آپ نے حضرت تھانوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے ترجمے اپنی کتابوں میں درج فرمائے ہیں، دوران درس آپ کی زبان سے جو شاہکار ترجمے نکلے وہ مفہوم کی ادائیگی میں بے مثال ہیں اور زبان وبیان کی دلکشی ورعنائی بھی ساتھ لیے ہوئے ہیں: " ألا ساء مايزرون" کا ترجمہ کیا: بہت ہی برا کرتے ہیں یہ لوگ، "بئس مثوى المتكبرين " انجام کار متکبرین کا برا ہوتا ہے، قرآن کی بعض آیات میں سابقہ قوموں کے واقعات کہیں اجمالاً اور کہیں صراحۃً مذکور ہیں، مولاناؒ ہلاک ہونے والی اور غضب الٰہی کا مستحق بننے والی قوموں کا تذکرہ پوری وضاحت کے ساتھ فرماتے ہیں، اور دنیا کے عروج وزوال کی تاریخ کو بھی دعوی سے مدلل کرتے تھے اور حقائق سے جی چرانے اور عقل وفہم رکھتے ہوئے عبرت نہ حاصل کرنے کو بزدلی اور حماقت سمجھتے تھے، ایک مرتبہ فرمایا: بصیرت جس قدر آئے گی فروتنی آئے گی، جہل جتنا ہوگا بے وقوفی کا مظاہرہ ہوگا، قرآن کے اس ٹکڑے " قـــل سيـــروا فـي الأرض " کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ پورے ملکوں کا دورہ کرکے دیکھ لیجیے کہ جھٹلانے والوں کا حشر کیا ہوا، مثال کے طور پر اٹلی کا ایک زمانہ میں بڑا شہرہ تھا، لوگ اس کے غلاموں کی صف میں شامل ہونا فخر سمجھتے تھے لیکن آج وہاں الو بھی اپنا بسیرا بنانے کے لیے نہیں ہے۔

قرآن کریم بحر ناپیدا کنار ہے، اس کے اندر بیش قیمت ہیرے وجواہرات ہیں، اس بحر میں غوطہ زنی کے لیے بقول مولانا عبداللہ عباس ندویؒ چند شرائط کا لحاظ رکھنا از حد ضروری ہے: ۱- ایمان بالغیب، قرآن فہمی کا اولین درجہ ہے ۔۲- عدم تکبر، کبریائی قرآن سے استفادہ کے لیے سم قاتل ہے، امام رازی رحمۃ اللہ علیہ ۳۰ جلدوں میں تفسیر لکھنے کے بعد کہتے ہیں کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سمندر کے کنارہ ایک بچہ ہوں اور کنکر اور بالو سے کھیل رہا ہوں یعنی وہ بحر زخار ہے اس کی حقیقت کا ادراک نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح قرآن کریم سے دشمنی کی تین نوعیتیں ہیں: ۱- تحدی، ۲- جھوٹا الزام، ۳- معنوی تحریف، اس تفصیل کے بعد مولاناؒ نے فرمایا کہ کسی بھی کام کے لیے دو چیزیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں: ۱- طریقہ، ۲- سلیقہ، ان دونوں کے فقدان سے موضوع کا صحیح حق ادا نہیں ہوسکتا۔

فہم قرآن کے لیے عربی نحو وصرف کے قواعد پر اچھی نظر ہونا ضروری ہے، مولانا عبداللہ عباس ندوی ان قواعد کے صحیح انطباق پر مہارت تامہ رکھتے تھے، اس پہلو سے بھی طلباء کی ذہن سازی اور کردار سازی کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ راقم سے فرمایا کہ: ''لعل'' کے معنی تم کو ''شاید کہ'' ابھی تک معلوم ہوں گے، لیکن حضرت تھانوی کا ترجمۂ قرآن لو اور فتح الرحمٰن لطالب آیات القرآن کے ذریعہ لعلكم تتقون ، لعلكم تعقلون ، لعلكم تذكرون کے تراجم نوٹ کرو۔ چنانچہ راقم نے پورے قرآن سے " لعل " کے مواقع استعمال لکھے اور ترجمے نقل کیے تو پتہ چلا کہ یہاں ''شاید کہ'' کا ترجمہ فساد معنی کو مستلزم ہے، اس لیے ''تاکہ'' کے ذریعہ اس کا ترجمہ کیا جائے گا، اور یہی ترجمہ تقریباً ہر جگہ مرقوم ہے۔

ہر زبان کا یہ اصولی قاعدہ ہے کہ اسکے مفردات اور الفاظ کو صحیح مقام میں رکھ کر معانی نکالے جانے چاہئیں، اگر اس کے برعکس کوئی روش روا رکھے جائے گی تو وہ عروس کلام کے گلہ کے ہار کے بجائے ذوق سلیم پر بار کے مرادف ہوگی، اسی مفہوم کی وضاحت ایک مرتبہ کچھ اس طرح فرمائی: لفظ کی براہ راست کوئی حیثیت نہیں، وہ بے کار ہے جب تک اس کو جوڑا نہ جائے، جیسے

اسٹیشن، اسٹیشن بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں پولیس اسٹیشن، ریلوے اسٹیشن وغیرہ، اسی وجہ سے بطور اصول فرمایا: ''لفظ کو اس کے سیاق وسباق سے سمجھنا ہی اس کی اصل ہے'' مطالعہ قرآن کے وقت اس اصول سے اغماض برتنا تحریف کے باب کو کھولنے کے مرادف ہوگا۔

قرآن کریم کے ہر مبتدی طالب علم کے ذہن میں یہ سوال گردش کرتا ہے کہ آخر کیا بات ہے کہ کلام الٰہی کے منجانب اللہ ہونے کی تائید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام ہونے کی تردید دوبار، سہ بار نہیں بلکہ دسیوں بار آئی ہے، اس کا تشفی بخش جواب دیتے ہوئے مولانا عبد اللہ عباس ندویؒ رقمطراز ہیں: ''یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن پر ایمان نہ لانے والے قرآن جیسی ایک بھی کتاب نہیں پیش کرسکے، مگر اپنی کدورت، قرآن سے بغض اور اسلامی دعوت کو پھیلنے سے دہشت اور خوف ان پر طاری رہا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنے غم وغصہ کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہوسکے، اور طرح طرح سے بدگوئی، مسخرہ پن، طنز وطعن کے زہر میں بجھے ہوئے الفاظ سے سب وشتم کے تیر برساتے رہے، وہ قرآن کا جواب تو نہیں دے سکے مگر اپنی دریدہ دہنی اور بے ہودگی سے اپنے غم وغصہ کا اظہار کرتے رہے، جس کی وجہ سے بہت سے سادہ لوح عرب قرآن پڑھنے اور سننے کی طرف مائل نہیں ہورہے تھے، اس لیے ضرورت تھی کہ سب سے پہلے اس پہلو پر زور دیا جائے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے''۔ ۴- اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں واقعات وحقائق کے ذکر میں کہیں ماضی کا صیغہ استعمال کیا ہے اور کہیں مضارع کا، نحو وصرف کے قواعد سے آشنا مبتدی طالب علم اگر ان درسی قواعد کی رعایت کرتے ہوئے ترجمہ کرتا ہے تو صحیح مفہوم اس کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے اور وہ سخت مخمصہ میں ہوتا ہے کہ اصولی قاعدوں کے خلاف یہ بات آرہی ہے، قرآن کے انہی خوشہ چینیوں کے لیے مولانا عبد اللہ عباس ندویؒ نے اپنی کتاب ''قرآن کریم: تاریخ انسانیت کا معجزہ ص ۲۵۵ پر لکھا ہے: ''ابوعبیدہ نے اپنے تجربہ اور استقراء سے یہ بات تسلیم کی ہے کہ عرب بول چال میں مضارع کی جگہ ماضی کا استعمال کرتے ہیں، اور اس کے لیے کسی فنی موشگافی اور منطقیانہ تاویل کی ضرورت نہیں، اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ عربوں کے روزمرہ میں اس طرح کے تصرفات عام ہیں'' اس بات کو مولانا مرحوم نے قرآن کریم کی دو آیتوں کے ذریعہ واضح کیا ہے، سورۂ مائدہ آیت ۹۵ میں ہے: ومن عاد فينتقم الله منه، سورۂ احزاب آیت ۵۰ میں ہے: وامرأة مؤمنة إن وهبت نفسها للنبي، ان دونوں آیتوں میں لفظ "عاد" اور "وهبت" "يعود" اور "تهب" کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

یہ تھی مولاناؒ کی قرآنی بصیرت کی ایک جھلک، درحقیقت یہی ان کا سوز نہاں ہے، جوان کا حرز جاں ہے، ان کا طرۂ ایمان ہے، ان کی آہوں کا دھواں ہے، برتر از ایں وآں ہے، باعث رشک قدسیاں ہے، راحت قلب عاشقاں ہے، سرمۂ چشم سالکاں ہے۔

صاحب اسلوب ادیب اور مصنف

مولانا سید عبد اللہ عباس ندویؒ ایک صاحب اسلوب ادیب اور مصنف تھے، خلاق ازل نے ان کی تحریر میں بلا کی تاثیر رکھی ہے، وہ اردو لکھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موتی رول رہے ہیں، ان کی تحریریں پڑھتے وقت قاری ایسے گلستاں میں پہونچ جاتا ہے، جہاں رنگ برنگ کے پھول ہیں اور وہ مشام جاں کو معطر کررہے ہیں، منتخب الفاظ، شستہ تعبیرات، چبھتے جملے اور برمحل محاوروں کا استعمال، اس پر مستزاد یہ کہ اردو اشعار سے استدلال، اور سلاست وروانی نے اس اسلوب کے حسن کو مزید نکھار دیا ہے۔

مولاناؒ نے لسانیات میں لیڈز سے پی ایچ ڈی کی ہے، عربوں کے درمیان سالہا سال آپ کا قیام رہا ہے، عربی صحافت پر آپ کی گہری نظر رہی، جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ میں عرب وعجم طلباء آپ کے حلقہ درس میں رہے، انگریزی زبان میں تو تراجم قرآن کا جائزہ اور تعلیم لغۃ القرآن اُن کی عربی اور انگریزی دانی کے واضح ثبوت ہیں، رابطہ عالم اسلامی کے انگریزی شعبہ کے ذمہ دار بھی ایک زمانہ تک رہے، اسی کے ساتھ ترجمہ نگاری کے فن میں آپ کو جو کمال حاصل ہے اس پر شاہد عدل آپ کے ترجمے ہیں: ردائے رحمت، احادیث نبویہ کی روشنی میں نظام معاشرت، المرتضیٰ، عربی میں نعتیہ شاعری وغیرہ، لیکن ان خوبیوں کے ساتھ مولاناؒ نے اردو زبان میں ادب وانشاء کے جو جوہر دکھائے ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

مشہور مثل ہے کہ: ''زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو''، مولانا عبد اللہ عباس ندویؒ کی اردو دانی کی گواہی اردو کے مایہ ناز ادباء وشعراء نے دی ہے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں میری طالب علمی کا زمانہ ہے، آپ کا قیام سعودی عرب میں ہے، لیکن وقتاً فوقتاً ندوہ بھی

تشریف لاتے ہیں، اور کچھ مہینے ندوہ میں قیام کرتے ہیں، اس درمیان آپ ندوۃ العلماء کے پندرہ روزہ ترجمان ''تعمیر حیات'' میں ''ع ع ن'' کے نام سے اداریے تحریر فرماتے ہیں، طلباء پرچے کے منظر عام پر آتے ہی اس کو خریدنے کے لیے ٹوٹ پرتے ہیں اور ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں، بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ پرچہ کے نسخے ختم ہوگئے، ابتدا میں تو ''ع ع ن'' کے مخفف کو سمجھنے میں دشواری ہوئی، لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا سید عبداللہ عباس ندویؒ کی شخصیت مراد ہے تو عقیدت ومحبت میں مزید اضافہ ہوا۔

حضرت مولانا سید عبداللہ عباس ندوی ندوی ثقافت کے سچے ترجمان تھے، اپنی وضع قطع اور رکھ رکھاؤ میں ہمیشہ ممتاز نظر آتے تھے، مجھے یاد ہے کہ میری طالب علمی کے زمانہ میں سلیمانہ ہال میں تقریری مسابقہ کی صدارت کے لیے مولانا تشریف لائے، ندوہ کے کئی اساتذہ حکم کے فرائض انجام دے رہے تھے، سلیمانیہ ہال طلباء سے بھرا ہوا تھا، موسم سرما کی وجہ سے بعض اساتذہ اور طلباء نے چادر اوڑھ رکھی تھی، مولانا نے اپنی صدارتی تقریر میں ثقافت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے رہن سہن، پہناوے میں ہم کو مثقف ہونا چاہیے۔ مولاناؒ جب ندوہ میں تشریف فرما ہوتے تو ایک بہار آجاتی تھی، طلباء واساتذہ خوب استفادہ کرتے، انتظامی مسائل میں بھی مولاناؒ دلچسپی لیتے، اور ہر ایک مسئلہ پر توجہ دیتے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی محبت ان کی گھٹی میں پڑی تھی، اسی لیے انہوں نے حضرت مولانا کی سیرت پر ایک ضخیم کتاب ''میر کارواں'' حضرت مولاناؒ کی زندگی میں لکھی، جس سے حضرت مولاناؒ کی شخصیت کے بعض چھپے پہلو سامنے آئے، حضرت مولاناؒ کے بعد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ نے جب ندوۃ العلماء کی نظامت سنبھالی تو ان کے ساتھ بھی گویا مولانا عبد اللہ عباس ندویؒ نے ہمیشہ اپنے کو چھوٹا بنا کر رکھا۔

مولانا سید عبداللہ عباس ندویؒ کے انتقال کے بعد ان کے خلف الرشید جناب مولانا ضیاء عبداللہ ندوی (مقیم جدہ) کے اہتمام میں ان کی کتابوں اور تصنیفات کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے، لیکن رسالوں اور پرچوں میں شائع ان کے سوانحی خاکے اپنی ادبی چاشنی اور معلومات کی دلآویزی کی وجہ سے منتظر اشاعت تھے، اللہ غریق رحمت کرے جواں مرگ مصنف وسوانح نگار مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کو، کہ انہوں نے اپنی وفات سے کچھ مہینے قبل ان سوانحی خاکوں کا انتخاب کیا، ان پر حواشی لکھے، تاریخ ولادت اور تاریخ وفات تحریر کیے، اور مرشد امت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے مقدمہ اور پروفیسر محسن عثمانی ندوی کی تقریظ سے آراستہ کر کے مسودہ کو طباعت کے لیے ہمارے سپرد کیا، ابھی طباعت کی تیاری جاری تھی کہ وہ راہی آخرت ہوگئے، انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔

کتاب ''مشاہیر ومعاصرین'' حضرت مولانا سید عبداللہ عباس ندوی کے سوانحی خاکوں پر مشتمل ہے، یہ مضامین رسالوں اور جریدوں میں شائع ہوئے، اور خوب پسند کئے گئے، حضرت مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی کے قلم کی شادابی اور لطافت نے ان میں ایک روح پیدا کر دی تھی، جن رسالوں میں یہ مضامین شائع ہوئے، ان کا وزن اور قدر بڑھا اور ان میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

پوری کتاب تین مرکزی ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب کا عنوان ہے: مشاہیر ومعاصرین، اس کا آغاز مولانا محمد علی جوہر کی تدفین سے ہے، اس کے بعد شاہ سلیمان پھلواری، والد ماجد مولانا مفتی عباس پھلواروی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا شاہ حلیم عطا سلونی، ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی، مولانا سید حسین احمد مدنی، افریقی براعظم میں اسلام کے مبلغ اعظم الحاج احمد بن بیللو، مولانا محمد اویس نگرامی ندوی، ، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مولانا سید محمد ثانی حسنی، ماسٹر سمیع صدیقی مولانا حافظ محمد عمران خان ندوی، شیخ حسن بن عبداللہ آل سعود، ڈاکٹر عبدالرحمٰن باشا، علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی، مولانا محمد حنیف ندوی، جنرل ضیاء الحق، مولانا منت اللہ رحمانی، مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی، مولانا شاہ عون احمد قادری، شیخ علی طنطاوی، اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہم اللہ وغیرہ ہیں۔

دوسرے باب کا عنوان انفرادیت وخصوصیت ہے، اس میں مشاہیر علماء کی شخصیت کے کسی ایک پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے، لیکن اس میں جامعیت اور علمیت کا رنگ غالب ہے، جیسے علامہ سید سلیمان ندوی اور فہم قرآن، مولانا عبدالماجد دریابادی اور ان کی تفسیر قرآن، مولانا محمد ثانی حسنی ندوی اور ان کا شعری دیوان میزاب رحمت، حضرت مولانا شاہ محمد امان اللہ قادری اور تصوف، حضرت مولانا علی میاں ندوی اور تفسیر قرآن، علامہ محمد بن ناصر عبودی رحمہم اللہ اور ان کے سفرنامے۔

تیسرے باب میں عبرت و موعظت کو موضوع بنایا گیا ہے، مثال کے طور پر مثیل عفلق

محروم غیر مرحوم، سابق وزیر اعظم ہند اندرا گاندھی کا واقعہ قتل ، آتشیں لحاف مشہور افسانہ نگار خاتون عصمت چغتائی کا جنازہ، پھولن دیوی کا قتل، وغیرہ

اس طرح یہ کتاب ۵۵۴ صفحات پر مشتمل ہے اور بیش قیمت مواد اور معلومات سے لبریز ہے، اسلوب ایسا نرالا اور دلکش ہے کہ انسان پڑھے اور پڑھتا چلا جائے ، اور مزید تشنگی باقی رہے، کتاب کے مطالعہ سے چند خصوصیات اور امتیازات سامنے آئیں وہ ذیل میں درج کی جارہی ہیں:

۱-ادب اسلامی کا نمونہ

مولانا عبد اللہ عباس ندویؒ زبان و ادب کی دنیا کی عظیم شخصیت تھے، اس تناظر میں ان کی یہ کتاب ادب اسلامی کا اعلیٰ نمونہ ہے، ادب اسلامی میں افادیت کا پہلو غالب ہوتا ہے ، اور ادب برائے زندگی کو ترجیح دیا جاتا ہے، اور ادب صرف چند محدود اصناف سخن کے اردگرد نہیں گردش کرتا، اس لیے یہ کتاب مشاہیر و معاصرین اگر چہ سوانح کے موضوع پر ہے لیکن ادبی شہ پاروں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے مولانا عبد اللہ عباس ندویؒ کے بارے میں خود ایک جگہ لکھا ہے: ''وہ عربی ، اردو دونوں میں بڑی شگفتہ اور قلم برداشتہ لکھتے ہیں، اردو میں ان کے بعض مضامین اور خاص طور پر ان کا مختصر، مگر دل چسپ اور پر از معلومات سفر نامہ ''چند دن دیار غیر'' میں بتاتا ہے کہ اگر وہ تصنیف و تالیف اور اردو تحریر و انشاء کے میدان کی طرف پوری توجہ کرتے تو اس میں خاصا نام اور مقام پیدا کرتے''۔

[عربی میں نعتیہ شاعری]

بحمد اللہ مولاناؒ کی پیشین گوئی صادق آئی ، اور مولاناؒ کی کتابوں اور آخری عمر تک پھیلی ہوئی تصنیفات اس کی گواہ ہیں کہ مولاناؒ نے اسلامی کتب خانہ کو اپنی تحقیقات و نگارشات سے مالا مال کیا ہے۔

۲- سادگی و پرکاری

مولانا عبد اللہ عباس ندویؒ کی تحریروں میں سادگی میں جو حسن پایا جاتا ہے، وہ انہیں کا خاصہ ہے، اور کسی شاعر نے کہا تھا:

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹے کہاں ہیں

اس سادگی میں نتیجہ خیزی اور اثر آفرینی کی جو کیفیت ہے، اس کو مندرجہ ذیل اقتباس میں جو ''ناگریز ساعت'' کے عنوان سے ہے، دیکھئے:

''اس زندگی میں ایک ایسی ساعت بھی آتی ہے، جب سرکش سے سرکش انسان بھی بے بس اور لاچار ہو جاتا ہے، اس کے غرور کو کوئی کچلنے والا کچلتا ہے، اور وہ دم نہیں مار سکتا، ایک طرف اس کے اعزا اور خدام بھی موجود ہیں، محبت و وفاداری کا دم بھرنے والے، صدقے اور قربان ہونے والے، پسینہ کی جگہ خون بہانے والے، احباب و نیاز مند بھی سامنے ہیں ، دوسری طرف اس کی دولت و وجاہت بھی دست بستہ کھڑی ہے، زندگی کی آن بان اور شان و شوکت بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے، نہ پانی نے اپنی تاثیر کھوئی ہے، اور نہ ہوا نے اپنا کام روکا ہے، آگ سے گرمی اور برف سے ٹھنڈک ختم نہیں ہوئی ہے، لیکن ایک مجبور و بے بس انسان ہے، جس کے حق میں نہ وہ احباب و نیاز مند کام آرہے ہیں ، جو ہمیشہ کے لیے خیر خواہ تھے، اور نہ وہ دولت کام آرہی ہے، جس کو عمر بھی ''ستار عیوب'' اور ''قاضی الحاجات'' سمجھتا رہا ، ہوا موجود ہے، لیکن سانس لینے کی طاقت جواب دے رہی ہے، آگ سے ٹھنڈا جسم گرم نہیں ہو رہا ہے، برف سے سوکھا ہوا حلق تر نہیں ہوتا، آنکھیں ہیں کہ اوپر ٹنگ گئی ہیں، ہاتھ پاؤں لکڑی کی طرح سخت ہو رہے ہیں روح جسم کا ساتھ چھوڑ رہی ہے، جان ''جان آفریں'' کے حضور واپس ہو رہی ہے، جس کے قید خانے سے روح مقید کی رہائی کا وقت ہے، سالہا چہرے کی یہ بے رنگی کتنی رنگین کہانیاں دہرا رہی ہے، یہی وہ وقت ہے، جب انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے''۔ [مشاہیر و معاصرین: ص ۶۱]

۳-جامعیت

مولاناؒ کی اس کتاب میں زبان و بیان کی چاشنی کے ساتھ وہ تمام خوبیاں اور محاسن موجود ہیں جو فن سوانح میں پائے جانے چاہیے، مولاناؒ نے سیرت و سوانح جیسے خشک موضوع کو ایسا پُر کشش اور دلپذیر بنا دیا ہے کہ قاری پڑھتا جائے اور عزت و سعادت کی بلندیوں پر چڑھتا جائے ، ابن خلکان کی کتاب ''وفیات'' میں جس طرح سوانح نگاری کے شخصیت کے قد اور اس کی قامت کا لحاظ رکھا گیا ہے، اور جس موضوع کی شخصیت ہوتی ہے اس کے اعتبار سے الفاظ اور تعبیرات استعمال کی جاتی ہیں ، اسی کی نقل کرتے ہوئے مولانا عبد اللہ عباس ندویؒ نے اس کتاب میں اسلوب نگارش اور سوانح کی خصوصیات کو اپنایا ہے، جس کو ہم جامعیت سے تعبیر کر سکتے ہیں، کبھی وہ ترشے ہوئے محاورے لاتے ہیں، کبھی وہ برمحل شعر لاتے ہیں ، کبھی وہ عمدہ تعبیرات استعمال کرتے ہیں ۔ اس طرح یہ کتاب ادبی اور سوانح خوبیوں کی جامع کتاب ہے۔

☆☆☆☆☆

تفکر وتدبر

مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

محمد اعظم ندوی (حیدرآباد)

ذکاوت وذہانت، جسے انگریزی زبان میں ''Intelligence'' کہا جاتا ہے، انسان کی ایک ایسی فطری خوبی ہے جو اُسے دوسروں سے ممتاز بناتی ہے، یہ ایک ہمہ گیر صلاحیت ہے جو مختلف شعبوں میں کامیابی کے لیے نہایت اہم ہے، ذکاوت کی تعریف مختلف انداز میں کی جاسکتی ہے؛ لیکن عمومی طور پر یہ ذہنی قابلیت، تیز فہمی، دقت نظر، حکمت ودانائی، فراست "سرعة البديهة" (حاضر جوابی اور بروقت فیصلہ لینے کی صلاحیت) اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی لیاقت جیسی خصوصیات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتی ہے، کسی بھی معاشرے کی ترقی اور بہتری کے لیے ذکاوت، فراست اور دور اندیشی جیسی صفات بہت اہمیت رکھتی ہیں، ابن جوزی نے کتاب الاذکیاء کے مقدمہ میں لکھا ہے: "فإن أجلّ الأشياء موهبة العقل، فإنه الآلة فى تحصيل معرفة الإله، وبه تضبط المصالح، وتلحظ العواقب، وتدرك الغوامض، وتجمع الفضائل'' (عقل سب سے بڑی بخشش ہے؛ کیوں کہ وہ اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہے، اور اسی سے نیکیوں کے اصول بنتے ہیں، اور انجام کا لحاظ کیا جاتا ہے، اور باریکیوں کو سمجھا جاتا ہے، اور فضائل حاصل کیے جاتے ہیں) [کتاب الاذکیاء، ابن الجوزی، ص۵]۔

ذکاوت کی بہت سی قسمیں ہوسکتی ہیں، علمی ذکاوت جس میں منطقی اندازِ فکر، ریاضیاتی مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت اور تجزیاتی فہم شامل ہیں، یہ تعلیمی میدان میں کامیابی کے لیے اہم ہے، اسی طرح تخلیقی ذکاوت نئے اور منفرد خیالات پیدا کرنے کی صلاحیت کو کہتے ہیں، اس میں آرٹس، سائنس اور ادب کے میدان میں نئی راہیں کھولنے کی قابلیت شامل ہے، ذکاوت کی بدولت انسان مختلف چیلنجوں کا سامنا کرسکتا ہے اور نئے مواقع سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، ذکاوت کے بغیر کسی بھی قسم کی تعلیمی، پیشہ ورانہ یا ذاتی واجتماعی کامیابی حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے، ذکاوت ایک فطری نعمت ہے، مگر اسے تعلیم ومطالعہ اور صحت مند طرز زندگی جیسے مناسب غذا، ورزش اور اچھی نیند کے ذریعہ بڑھایا جاسکتا، اس سے ذہنی صحت کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے، اسی طرح تخلیقی سرگرمیوں اور الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانے میں حصہ لینے سے ذہنی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے، کسی صاحب نظر کا قول ہے: "المؤمن كيّسٌ فطنٌ" [مؤمن ہوشیار اور عقل مند ہوتا ہے]، حکمت اور دانش مندی مسلمانوں کے لیے نہایت اہم ہے، خصوصاً اسلام پر ہونے والے اعتراضات کے عقلی اور الزامی جوابات کے لیے علماء ودعاۃ میں علم ومطالعہ کے ساتھ مخاطب کی نفسیات سے واقفیت اور حاضر دماغی کا بڑا حصہ ہوتا ہے، میں یہاں ایسے ہی کچھ اہم واقعات کا ذکر کرتا ہوں جن سے سبق حاصل کرتے ہوئے ہم اپنی حکمت ودانائی اور فہم وفراست کا جائزہ لے سکتے ہیں اور ان میں اضافہ کی دعا اور کوشش کرسکتے ہیں:

انبیاء کرام علیہم السلام کو دانش مندی اور معاملہ فہمی سے حصہٴ وافر عطا کیا گیا تھا؛ چنانچہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس خون میں رنگی ہوئی قمیص لائی گئی، جس میں کوئی پھاڑنے کا نشان یا خراش کا اثر نہیں تھا، اور برادرانِ یوسف روتے بلکتے ہوئے آئے اور کہا: ''ہم سب تو دوڑ کے مقابلہ میں لگ گئے، اور ہم نے یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا، یہاں تک کہ اسے بھیڑیا کھا گیا''، تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا تھا: ''بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنالی ہے'' [یوسف:۱۶-۱۸]، کیوں کہ انہوں نے اپنی فراست وبصیرت سے حقیقت حال کا ادراک کرلیا تھا، اور ایک روایت کے مطابق کہا تھا: "إني لأعلم أن الذئب ليس حليمًا'' (مجھے معلوم ہے کہ بھیڑیا نرم دل نہیں ہوتا)، جب حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس کھیت اور اس میں رات کے وقت گھس کر اسے روند دینے والی بکریوں کا معاملہ پیش آیا، حضرت داؤد علیہ السلام نے ابتدا میں فیصلہ کیا کہ کھیت کے مالک کو اس کو ہونے والے نقصان کے عوض بکریاں دے دی جائیں، پھر جب یہ معاملہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ کھیت کا مالک بکریاں لے جائے، اور ان کا دودھ اور اون استعمال کرے، جبکہ بکریوں کا مالک کھیت کو درست کرے، جب کھیت اپنی اصلی حالت میں واپس آجائے تو کھیت کے مالک کو اس کا کھیت اور بکریوں کے مالک کو اس کی بکریاں واپس دے دی جائیں، فرمایا گیا: ''ہم نے سلیمان کو صحیح فیصلہ سمجھا دیا اور دونوں کو ہی ہم نے حکمت اور علم سے

نوازا تھا‘‘[انبیاء: ۷۹]،اس ضمن میں وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ دو عورتیں آئیں، ان میں سے ہر ایک کے پاس ایک شیر خوار بچہ تھا، وہ دونوں کسی غیر آباد مقام کی طرف نکل گئیں، تو ایک بھیڑیا ان میں سے ایک کے بچے پر حملہ آور ہو گیا اور اسے لے گیا، دونوں دوسرے بچے کے بارے میں جھگڑنے لگیں اور دونوں کا دعوی تھا کہ یہ بچہ میرا ہے، تو حضرت داؤد علیہ السلام نے بڑی کے حق میں فیصلہ دیا، کہا جاتا ہے کہ یہ فیصلہ اس لیے کیا گیا کیوں کہ بچہ اسی کے پاس تھا، اور کوئی ثبوت موجود نہیں تھا، تو اسی قرینہ کو کافی سمجھا گیا؛ لیکن جب وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس گئیں اور معاملہ بیان کیا، تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا: ’’چھری لاؤ، میں اسے دو نیم کر کے تم دونوں کے درمیان تقسیم کر دیتا ہوں‘‘، اس پر چھوٹی نے کہا: ’’نہیں! یہ اس کا بچہ ہے، خدا کے لیے اس پر رحم کر دیں‘‘، حضرت سلیمان علیہ السلام نے فیصلہ دیا کہ بچہ چھوٹی کا ہے، کیوں کہ حقیقی ماں کی ممتا نے بچے کی جان بچانے پر زور دیا، چاہے وہ اس کے پاس نہ ہو، کسی اور کے پاس پرورش پائے، اس سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھانپ لیا کہ بچہ اسی کا ہے، تو انہوں نے اس کے حق میں فیصلہ دیدیا[صحیح بخاری]’’ووهبنا لداؤد سليمان نعم العبد إنه أواب‘‘[حدیث نمبر: ۳۴۲۷]، تاریخ اسلام میں قضاۃ کی ذکاوت وفطانت کے بے شمار واقعات ملتے ہیں۔

اسی طرح ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے پہلے بھی بہت اعلیٰ درجہ کی ذہانت و فطانت حاصل تھی، جب حجر اسود کو اس کی جگہ پر رکھنے کا معاملہ پیش آیا تو آپ نے ایک چادر منگوائی، اور متنازع فریقوں سے کہا کہ اس کے کناروں کو پکڑیں اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک ہاتھوں سے حجر اسود کو اس کی جگہ پر رکھا، نبوت کے بعد بھی ایسے متعدد مواقع پیش آئے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذہانت ودور اندیشی کے بے مثل نمونے سامنے آئے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور مکہ یک صلح کی بنیاد پر ابھی مشرکوں کے زیر اقتدار تھا، تو کفار نے صحابہ کرامؓ کے بارے میں کہا: ’’وهنتهم حمى يثرب‘‘ (یثرب کے بخار نے انہیں کمزور کر دیا ہے)، اور کفار نے مارے غرور کے مسلمانوں سے ملنے سے بھی انکار کر دیا اور پہاڑ پر جمع ہو گئے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حکم دیا کہ طواف کے سات پھیروں میں سے تین شوط میں رمل کریں یعنی شانوں کو حرکت دیتے ہوئے تیز قدم اٹھائیں اور بہادروں کی طرح چلیں، اور انہیں دکھائیں کہ وہ کمزور نہیں ہیں، ’’ارملوا، أروهم أن بكم قوة‘‘ حالانکہ وہ اس وقت کافی تھکے ہوئے تھے، اور رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان آرام سے چلیں، کیوں کہ کفار مکہ ایسی جگہ بیٹھے تھے کہ انہیں اس حصہ میں نہیں دیکھ پا رہے تھے، جب صحابہ نے ایسا کیا تو دشمنوں نے کہا کہ: ’’یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم نے کہا تھا کہ یثرب کے بخار نے انہیں کمزور کر دیا ہے‘‘[شرح معانی الآثار للطحاوی]، اس سے کفار مکہ پر نفسیاتی دباؤ پڑا اور مسلمانوں کی قوت وشوکت ظاہر ہوئی، واضح رہے کہ یہ ۷ھ میں عمرۂ قضاء کا واقعہ ہے، حجۃ الوداع میں جب آپ نے حج فرمایا تو تین چکروں میں مکمل رمل کیا، رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان بھی، اور یہی سنت باقی رہی۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کی قوتِ فہم بھی بہت بلند تھی، جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ کے اخیر میں ایک خطبہ دیا، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بتایا کہ خدا نے اپنے ایک بندہ کو اختیار دیا ہے کہ وہ دنیا میں رہنے کو ترجیح دے یا جو کچھ اللہ کے پاس ہے اسے اپنے لیے پسند کر لے، اس نے جو خدا کے پاس ہے، اسے پسند کر لیا ہے، تو حضرت ابو بکر صدیقؓ ان الفاظ کو سنتے ہی رو پڑے، جب کہ باقی صحابہ ان کے درمیان تھے، ان کو ان کے رونے پر تعجب ہوا، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک نیک بندے کے بارے میں بتا رہے ہیں تو اس میں رونے کی کیا بات ہے! بعد میں پتہ چلا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وصال کی طرف اشارہ فرما رہے تھے، اور اسے حضرت ابو بکرؓ اسی وقت سمجھ گئے، اور حاضرین کو بتا دیا [بخاری، کتاب المناقب]، خلیفۂ راشد اول حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس موقع پر بھی غیر معمولی ذہانت سے کام لیا جب انہوں نے ہجرت کے دوران کبھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور کبھی پیچھے چلنے کا طریقہ اپنایا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا، تو انہوں نے جواب دیا: ’’أذكر الطلب فأمشي خلفك، ثم أذكر الرصد، فأمشي بين يديك‘‘ (خیال آتا ہے کہ وہ پیچھا کر رہے ہوں گے تو آپ کے پیچھے چلنے لگتا ہوں، اور جب یہ ڈر ہوتا ہے کہ کہیں گھات لگا کر تاک میں نہ بیٹھے ہوں تو نظر دوڑانے کے لیے آگے چلنے لگتا ہوں)[مستدرک حاکم]۔

ایک خاتون حضرت عمر بن خطابؓ کے پاس آئی اور کہنے لگی: ’’میرے شوہر ایک نیک آدمی ہیں، عبادتوں میں بڑے مجاہدے کرتے ہیں، راتوں میں اٹھ کر عبادت کرتے ہیں اور دن کو روزہ رکھتے ہیں‘‘، تو انہوں نے اس کی تعریف کی اور شاباشی دی کہ ایک خاتون اپنے خاوند کی

تعریف کررہی ہے، وہاں ایک ذہین وفطین صحابی کعب بن سورازدی موجود تھے، انہوں نے کہا: امیر المومنین! آپ اس کی تعریف کررہے ہیں، جب کہ اس خاتون نے شکایت میں بڑی مہارت سے کام لیا ہے، حضرت عمر فاروقؓ نے پوچھا: کس کی شکایت کی ہے؟، انہوں نے جواب دیا: اپنے شوہر کی، مطلب یہ ہے کہ وہ اُس کے قریب نہیں آتا، اور ازدواجی حقوق ادا نہیں کرتا، تو حضرتؓ نے فرمایا: جب تم بات سمجھ ہی گئے ہو تو ان کے درمیان فیصلہ کردو، انہوں نے فیصلہ کیا کہ اگر فرض کرلیں کہ اس کی چار بیویاں ہیں تو بھی ہر چوتھی رات میں اس بیوی کا حق بنتا ہے، جب کہ ایک ہی ہے، تو اگر تین راتیں بھی مسلسل عبادت کرنا چاہتا ہو تو کرے؛ لیکن چوتھی رات بیوی کے پاس گذارے، یہ فیصلہ حضرت عمرؓ کو اتنا پسند آیا کہ انہوں نے ان کو بصرہ کا قاضی بنادیا۔ [الاستیعاب لابن عبدالبر، ص ۶۷]

حیرت انگیز ذہانت کے وہ نمونے بھی قابل مطالعہ ہیں جو غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دیتے وقت جوابات کی شکل میں سامنے آئے، جب قاضی ابوبکرؒ عیسائیوں سے ڈبیٹ کرنے کے لیے رومیوں کے پاس گئے، وہ ایک بڑی عظیم الشان مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، جس میں ان کا سب سے بڑا پوپ موجود تھا، تو انہوں نے اسی سے آغاز کیا، اور پوچھا: آپ اور آپ کے اہل وعیال کیسے ہیں؟ یہ سنتے ہی حاضرین سخت ناراض ہوئے اور کہا: تم پر افسوس! ہمارے پوپ کا احترام کرو! وہ خواہشات کی سطح سے اوپر ہیں، ان کے لیے شادی کرنا مناسب نہیں، پھر بچے کیسے ہوں گے! ہمارے پادری صاحب نہ شادی کرتے ہیں نہ بچے کی پیدائش سے ان کوئی سروکار، تو انہوں نے کہا: تم پر افسوس! تم نے اپنے پادری کو اس کی بیوی اور بچوں سے بلند کردیا! اور اپنے رب کے لیے بیوی اور بیٹے مان لیے، وہ یہ جواب سن کر ہکا بکا رہ گئے، اور فوراً ہی ایک گستاخانہ سوال پوچھ بیٹھے: تمہارے نبی کی اس بیوی کا کیا معاملہ ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک اجنبی آدمی کے ساتھ سفر میں تھیں؟ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی طرح سات آسمانوں کے اوپر سے بری کردیا جس طرح اس نے مریم علیہا السلام کو بری کیا، سوائے اس کے کہ مریم کو بیٹا ہوا اور عائشہؓ کی کوئی اولاد نہ تھی، یہ جواب سن کر وہ پھر لاجواب ہوگئے، اور کوئی جواب نہ بن پڑا تو تیسرا سوال کیا کہ تمہارے لیے ہماری عورتوں سے نکاح کرنا جائز ہے، لیکن ہمارے لیے تمہاری عورتوں سے نکاح کیوں درست نہیں! انہوں نے جواب دیا: ہم آپ کے نبی پر ایمان لائے ہیں؛ اس لیے ہم آپ کی بہن بیٹیوں سے نکاح کرسکتے ہیں، اگر آپ بھی ہمارے نبی پر ایمان لے آئیں تو ہم آپ کا نکاح اپنی مسلم خواتین سے کردیں گے، اس جواب پر سناٹا چھا گیا، اور کوئی جواب نہ بن پڑا۔

رستم کے دربار میں حضرت ربعی بن عامرؓ کا بے باک انداز اور دوٹوک جواب ان کی دور اندیشی کو سمجھنے کے لیے کافی ہے، حضرت امام ابو حنیفہؒ کے بے شمار واقعات ملتے ہیں جن میں انہوں نے اپنی حاضر جوابی سے ملحدین کو بے زبان کردیا، اور بھی ائمہ وعلماء، اور مناظرین ومبلغین بڑی تعداد میں ملتے ہیں جنہوں نے ترکی بہ ترکی جوابات دینے کی بجائے دانش مندانہ اور مدلل جوابات سے اسلام کا دفاع کیا، ان کی ذہانت کی داد دی گئی، اور ہدایت بھی عام ہوئی، آج شدید ضرورت ہے ایسے علماء کی جو مخالفین اسلام کے فکر ونظر کا مطالعہ کریں اور اس کی روشنی میں آسان عقلی جوابات کی تیاری کریں جو سائنٹفک اور منطقی ہو، اور غیر جانبدار لوگوں کے ذہن ودماغ کو اپیل کرنے والا ہو:

تقدیر اُمم کیا ہے، کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

☆☆☆☆☆

خدا پر ایمان واستقامت

مولانا ابوالکلام آزادؒ

مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے، سچے مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلاسکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈراسکتا ہے، چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہوجانے سے ڈرو نہیں، انہوں نے تمہیں جانے کے لیے ہی اکٹھا کیا تھا، آج انہوں نے تمہارے ہاتھ میں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے تو یہ تعجب کی بات نہیں، یہ دیکھو کہ تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہوگئے، اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہے تو ان کو اپنے اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امی کی معرفت فرمایا تھا: ''جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو ان کے لیے نہ کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم''۔ ہوائیں گزر جاتی ہیں، یہ صرصر سہی؛ لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں، ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا یہ موسم گزرنے والا ہے، یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔

☆☆☆

عیدِ قرباں

قربانی کی اصل روح اور اس کا پیغام

محمد سلمان ندوی بجنوری

حضرت ابراھیم علیہ السلام کی عظیم قربانی

عیدالاضحیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عظیم قربانی کی یادگار ہے، ایسی قربانی جس کا تصور بھی کرنا دشوار ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تو پوری زندگی انسانیت کے لیے عظیم مثالی نمونہ ہے، بچپن سے لے کر جوانی اور جوانی سے لے کر بڑھاپے تک آپ نے بڑی بڑی آزمائشوں کا سامنا کیا اور ہر آزمائش اور امتحان میں آپ ثابت قدم رہے، آپ کے ایمان و یقین اور ثبات قدمی میں ذرا جنبش تک نہیں آئی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بڑھاپے میں حضرت اسماعیل جیسا عظیم فرزند عطا کیا، جس کے اندر عظیم نمایاں خصوصیات وصفات موجود تھیں، جو حلیم و بردبار اور اپنے والد کا فرماں بردار تھا، جس کی پیشانی سے آخری نبی کی آمد کے آثار ہویدا تھے، ایسا فرزند جس کی پورے عالم میں کوئی مثال نہیں دی جاسکتی تھی، اس فرزند کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہورہا ہے کہ اس کو قربان کردو، یہ حکم بذریعہ خواب دیا گیا اور انبیاء کے خواب بھی وحی ہوتے ہیں، لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس بات کا انتظار نہیں کیا کہ اور وضاحت ہوجائے یا جبریل علیہ السلام آکر وضاحت کریں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اسماعیل کو ذبح کرو، اللہ تعالیٰ کا اشارہ ملتے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے محبوب فرزند کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار ہوگئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کوئی سوال یا اعتراض نہیں کیا کہ فرزند کے ذبح کرنے کی کیا ضرورت ہے، ہم جانوروں کو ذبح کردیتے ہیں یعنی اطاعت و فرماں برداری اور سرتسلیم خم کردینے کی اعلیٰ مثال پیش فرمائی اور اپنے فرزند اور اہلیہ کو بھی تیار کرلیا اور گویا سب گھر والے تیار تھے کہ اللہ کے حکم کو پورا کرنا ہے چاہے زمین کانپ جائے یا پہاڑوں پر رعشہ طاری ہوجائے یا آسمان پھٹ جائے، اللہ تعالیٰ کا حکم ہے تو اس کو ہر حال میں پورا کرنا ہے، اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں نہ ماں کے دل میں کوئی کھٹک پیدا ہوئی، نہ بیٹے کو کوئی ڈر وخوف لاحق ہوا اور نہ والد کے قدم لڑکھڑائے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے کے لیے بیٹے کو قربان گاہ لے گئے اور اپنے پورے قصد وارادے سے فرزند کی گردن پر بغیر کسی ہچکچاہٹ اور لرزے ہوئے چھری چلا دی، ابھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نہیں معلوم کہ انہوں نے چھری فرزند پر چلائی ہے یا جانور پر چلائی ہے، بعد میں جب دیکھا تو فرزند دوسری طرف کھڑے ہیں اور دنبہ ذبح ہوچکا ہے، آسمان لرز گیا، زمین کانپ اٹھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دانست میں حضرت اسماعیل کو قربان کردیا تھا؛ لیکن اللہ تعالیٰ کو امتحان لینا مقصود تھا، یہ تھے اللہ تعالیٰ کے خلیل اور دوست اور ان کا اللہ تعالیٰ سے انتہائی درجہ کا عشق کہ: ”إِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن، لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِیْن“ [الأنعام:۱۶۲].

قربانی کی اصل روح

اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کی اس ادا کو پسند فرما کر پوری امت مسلمہ کے لیے بطور سنت نافذ کردیا، لیکن کیا اللہ تعالیٰ کو جانوروں کی قربانی مقصود ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ بڑی تعداد میں جانوروں کو ذبح کرانا چاہتے ہیں؟ کیا اللہ تعالیٰ کو جانوروں کا خون اور گوشت چاہیے؟ اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کا ازالہ خود فرمادیا ہے، فرمایا:

”لَن یَنَالَ اللّٰہَ لُحُومُھَا وَلَا دِمَاؤُھَا وَلَـٰکِن یَنَالُہُ التَّقْوَیٰ مِنکُمْ“ [الحج:۳۷] (اللہ تعالیٰ کو ان جانوروں کا نہ گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون پہنچتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے)۔

ہم مسلمانوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ہم جو بھی عمل کرتے ہیں اس کو رسم کی شکل دے دیتے ہیں، جس سے اس عمل کی روح نکل جاتی ہے اور اگر کسی چیز سے اس کی روح نکل جائے تو اس کی کوئی حقیقت نہیں رہتی وہ شے بے حقیقت ہوجاتی ہے، لہٰذا ہم اصل مقصد ہی سے ہٹ جاتے ہیں۔ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ اصل قربانی اپنے نفس، اپنی خواہشات کو کچل دینے کا نام ہے اور پوری اسلامی زندگی اسی اصل قربانی سے تعبیر ہے اور یہی قربانی کی روح ہے، ہم دین پر عمل کرتے ہیں لیکن جہاں خواہش درمیان میں آتی ہے دین کو کنارے کردیتے ہیں اور خواہش پر عمل کرتے ہیں، معلوم ہوا کہ دین پر عمل بھی خواہش کی بنیاد پر ہے، نماز پڑھنے کی خواہش تھی تو پڑھ رہے تھے لیکن اب خواہش نہیں ہے تو ہم نے

نماز پڑھنا چھوڑ دیا، فجر کی نماز پڑھنے میں نیند حائل ہوتی ہے، ہم عام طور سے فجر کی نماز چھوڑ دیتے ہیں، نیند کا غلبہ ہے اور سونے کی خواہش ہے، لہٰذا اٹھ کر بھی نہیں اٹھتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اتنی عظیم قربانی جانور کی قربانی نہیں تھی بلکہ آپ کے نفس، خواہشات اور فرزند کی محبت اور چاہت کی قربانی تھی، جس کو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم اور اللہ کی محبت کے سامنے قربان کر دیا، لیکن حیف صد حیف کہ ہماری ظاہری قربانی بھی اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں ہوتی، وہ بھی نام ونمود اور ریاکاری اور دکھاوے کی نذر ہو جاتی ہے، جانور کی قربانی میں بھی ہماری گوشت کھانے پر نظر رہتی ہے، زیادہ مہنگا جانور صرف اس لیے خریدا جاتا ہے کہ معاشرے میں پتا چلے کہ فلاں کا جانور سب سے مہنگا اور سب سے زیادہ فربہ ہے، ابھی تک ہم حقیقی قربانی کے معنی بھی نہیں سمجھتے، قربانی کی روح سے ہم واقف ہی نہیں، حقیقی قربانی کا ہمیں ایک حبہ مل سکتا تھا، اگر ہم جانور کو دس، پندرہ دن پہلے خرید لیتے اور اس کی خدمت کرتے اور جب ہم اس سے مانوس ہو جاتے اور وہ ہم سے مانوس ہو جاتا تو پھر اس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کرتے تو شاید ہمیں حقیقی قربانی کا کچھ احساس ہوتا، لیکن مسلمانوں کا یہ معمول ہو چکا ہے کہ عیدالاضحیٰ کی رات کو یا صبح ہی کو جانور خریدتے ہیں اور اس کو فوراً قربان کر دیتے ہیں، یہ ہے ہماری قربانی، گویا ہم نے سنت ادا کر دی، لیکن کیا ہمیں اس قربانی کا کچھ احساس ہوا، سوائے اس کے کہ ہم نے پیسے خرچ کر کے جانور خریدا، اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھ عطا فرمائے۔

قربانی کا پیغام

ہم مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ ہم عبادت کی روح کو باقی رکھیں اور اس کے مقصد کو کبھی فراموش نہ کریں، اگر عبادت سے روح نکل گئی یا مقصد ہی فوت ہو گیا تو ہماری بڑے سے بڑے جانور کی قربانی کرنے سے بھی کچھ حاصل نہ ہوگا، سب سے پہلے ہم یہ طے کریں کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر ہم جانور پر چھری چلانے سے پہلے اپنے نفس، اپنی خواہشات پر چھری چلائیں گے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرنے کا پیغام یہ ہے کہ ہم اپنی تمام تر خواہشات اور چاہتیں اللہ تعالیٰ کے تابع کر دیں، جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم آئے ہماری گردنیں جھک جائیں، اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری میں اگر ہماری خواہشات حائل ہوں تو پہلے ان کو ذبح کریں، ان کو کچل کے رکھ دیں، جو اللہ تعالیٰ نے حدود قائم کی ہیں ان سے ایک بالشت بھی آگے بڑھنے کی کوشش نہ کریں، ایمان لانے کے بعد ہماری ہر چاہت، ہر عمل اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہونا چاہیے، اگر حقیقی معنوں میں ایمان ہوگا اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حقیقی محبت ہوگی تو ہمارے لیے ہر طرح کی قربانی دینا آسان ہوگا، اس وقت ہم قربانی کی روح کو بھی بیدار کر سکیں گے اور اس کے مقصد کو بھی حاصل کر لیں گے اور پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں سرخ رو ہوں گے، ان شاء اللہ۔

☆☆☆☆☆

ایثار وقربانی میں کامیابی

مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی

عید قرباں کا مبارک دن ان مقدس ہستیوں کی یاد دلاتا ہے جن کی پوری زندگی خیر خواہی، بہی خواہی، امن وسلامتی اور ظلم وزیادتی کے وقت صبر وتحمل سے عبارت ہے، جنھوں نے حالات وزمانہ کے آہنی پنجوں سے نبرد آزمائی کی اور زمانہ کے رخ کو موڑ دیا اور بلکتی ہوئی انسانیت کے سہارا بنے، دیکھنے میں وہ کمزور وناتواں تھے؛ لیکن عزم وارادہ کے دھنی اور فکر وعقیدہ میں ایسے پختہ کہ اٹھتے ہوئے شعلوں کے طوفان سے بھی وہ نہ گھبرائے، یہ دن اپنے ساتھ سچائی اور سلامتی کے راستے کو اپنانے کا پیغام لے کر آتا ہے، ظلم وزیادتی کرنے والوں کے برے انجام کی یاد دلاتا ہے، اپنے فائدے کے لیے دوسروں کا حق مارنے والے کو عبرت ناک انجام سے خبردار کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ ایثار وقربانی کی راہ خواہ کتنی ہی پرخطر اور کٹھن کیوں نہ ہو اس پر چلنے والے ہمیشہ کامیاب وکامران ہوتے ہیں، قدرت انھیں ایسی زندگی عطا کرتی ہے جس کے آگے موت کی ساری چالیں بیکار ہو جاتی ہیں، ان کے اصول، ان کے نقش قدم اور ان کی تعلیم آنے والی نسلوں میں اخلاقی گراوٹ سے بچنے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ انسان سے محبت کرنے والے، دوسروں کے لیے تکلیف اٹھانے والے، سچ بولنے اور حق کا ساتھ دینے والے اور مظلوموں کی مدد کرنے کے لیے سینہ سپر ہونے والے ایسے چراغ روشن کر جاتے ہیں جن کی روشنی سے ہر اس برائی کے اندھیر دور ہوتے رہتے ہیں، جو انسانیت کو تاریکی اور پستی کی طرف لے جاتے ہیں۔

☆☆☆

فقہ وفتاویٰ

سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی

سوال : قربانی کیوں کی جاتی ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟

جواب : قربانی دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگار، ان کی پیغمبرانہ اور روحانی زندگی کی خاص خصوصیت اور ملت ابراہیمی کی اصل پہچان ہے یہ محض خون بہانے اور گوشت کھانے کا نام نہیں بلکہ قربانی نام ہے روح اور دل کو خدا کی راہ میں نچھاور کردینے کا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاءُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ" [سورۂ حج] یعنی خدا کے پاس قربانیوں کا خون اور گوشت نہیں پہنچتا، اس کے پاس صرف تمہارا تقویٰ پہونچتا ہے، یہ آیت بتاتی ہے کہ قربانی کا مقصد روح اور دل کو خدا کی راہ میں نچھاور کرنا ہے، اور خدا کے ہر حکم پر اپنے کو مٹا دینا ہے۔

سوال : قربانی کی فضیلت کیا ہے؟

جواب قربانی کی فضیلتیں احادیث نبوی میں بہت زیادہ ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص اللہ کی راہ میں قربانی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس جانور کے ایک ایک بال کے بدلہ قربانی کرنے والے کے ایک ایک گناہ کو معاف کرتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قربانی کے دنوں میں قربانی سے زیادہ کوئی بھی عمل اللہ تعالیٰ کو محبوب نہیں، قربانی کا یہ عمل قیامت کے سینگوں، بالوں اور کھروں کے ساتھ سامنے آئے گا یعنی اسکے ہر عضو کا بدلہ ملے گا، سینگ، بال اور کھر کا بھی اور جب تم قربانی کرتے ہو تو جانور کا خون ابھی زمین پر نہیں گرتا اس سے پہلے وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پہونچ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں تقرب کا ذریعہ بن جاتا ہے، ان حدیثوں کے علاوہ اور بھی حدیثیں کتب احادیث میں موجود ہیں۔

[جامع ترمذی: ج۱/ص۲۷۵]

سوال : جو لوگ وسعت کے باوجود قربانی نہیں دیتے ہیں ان کے بارے میں شرع کا کیا حکم ہے؟

جواب: جو لوگ قربانی کرنے کی وسعت رکھتے ہیں اس کے باوجود قربانی نہیں کرتے ہیں، ان کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی ناراضگی ظاہر فرمائی ہے اور ارشاد فرمایا کہ جو وسعت کے باوجود قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے، یہ فرمان نبوی بتاتا ہے کہ ایسا شخص بارگاہ خداوندی میں حاضری کے لائق نہیں ہے۔

[مشکوٰۃ، باب فی الاضحیہ: ج۱/ص۱۲۷]

سوال : عید کی نماز سے قبل کچھ کھانا پینا کیسا ہے؟

جواب : سنت یہ ہے کہ عیدالاضحیٰ کی نماز کے بعد کھائے اور قربانی کے گوشت سے آغاز ہو تو بہتر ہے، حضرت بریدہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ آپ عیدالفطر کی نماز کے لیے کچھ کھا کر تشریف لے جاتے تھے اور عیدالاضحیٰ کے دن نماز پڑھنے تک کچھ نہ کھاتے تھے، [ترمذی، ابن ماجہ] لیکن اگر کوئی عیدالاضحیٰ کی نماز سے قبل کھا لے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، فقہاء نے صراحت کی ہے کہ بقرعید کے دن نماز سے قبل کھانے میں کوئی کراہت نہیں ہے لیکن نماز سے قبل نہیں کھانا چاہئے بلکہ مستحب یہ ہے کہ اس روز سب سے پہلے قربانی کا گوشت کھائے جو اللہ کی طرف سے ضیافت ہے۔

[فتاوی ہندیہ: ج۲/ص۷۲]

سوال : قربانی کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

جواب: قربانی کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ اپنی قربانی کو آدمی خود ذبح کرے، اگر ذبح کرنا نہیں جانتا ہو تو دوسرے کو قائم مقام بنا کر اس سے ذبح کرا سکتا ہے البتہ ذبح کے وقت اس کا حاضر رہنا بہتر ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو ذبح کے وقت حاضر رہنے کی تاکید فرمائی تھی۔

[الترغیب والترہیب: ج۲/ص۵۵،۵۴]

قربانی کرتے وقت قربانی کی نیت کرے، جانور ذبح کرنے سے قبل پوری تیاری کرلے، جانور کو قبلہ رخ لٹائے اور "اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ پڑھ کر "بسم اللہ، اللہ أکبر" کہے اور جانور ذبح کردے، ذبح کے بعد یہ دعاء پڑھے: "اللّٰھم تقبلہ منی کما تقبلت من حبیبك محمد و خلیك ابراھیم علیھماالسلام" البتہ شوافع کے یہاں بسم اللہ پڑھنے کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے۔

[شرح المہذب: ج۹/ص۴۰۹]

سوال : قربانی کے گوشت کے استعمال کا طریقہ کیا ہے؟

جواب : گوشت کا مستحب طریقہ یہ ہے کہ اسکے تین حصے کئے جائیں، ایک حصہ اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے رکھے، دوسرا حصہ اعزہ و اقارب اور دوست احباب کو دے اور تیسرا حصہ فقراء ومساکین میں تقسیم کرے۔

[بدائع الصنائع: ج۵/ص۸۱]

☆☆☆☆☆

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

باسمہٖ تعالیٰ

تاریخ ۱۰، ۲۵/جون ۲۰۲۴ء

Date 10,25th June 2024

اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی و تربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اور ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین و دنیا کی جامعیت اور علم و روحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری و امتیاز کا اعلان و اظہار، دین حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون و اعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات و عطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(مولانا) جعفر مسعود حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA

عطیات	A/c No. 1086 3759 711
تعمیرات	A/c No. 1086 3759 733
زکوٰۃ	A/c No. 1086 3759 766

IFSC CODE : SBIN0000125 - STATE BANK OF INDIA, MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:

NADWATUL ULAMA

اور اس پتہ پر ارسال کریں:

Nizamat office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marge, Lucknow - 226007 (U.P.)

معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر

+91-8736833376

پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔

فجزاکم اللہ خیر الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا